ماہنامہ

آنکھ مچولی

کراچی

دسمبر ۱۹۹۲ء

100 اسکول بیگ کا تحفہ

تفصیلات صفحہ ۴ پر ملاحظہ کیجیے

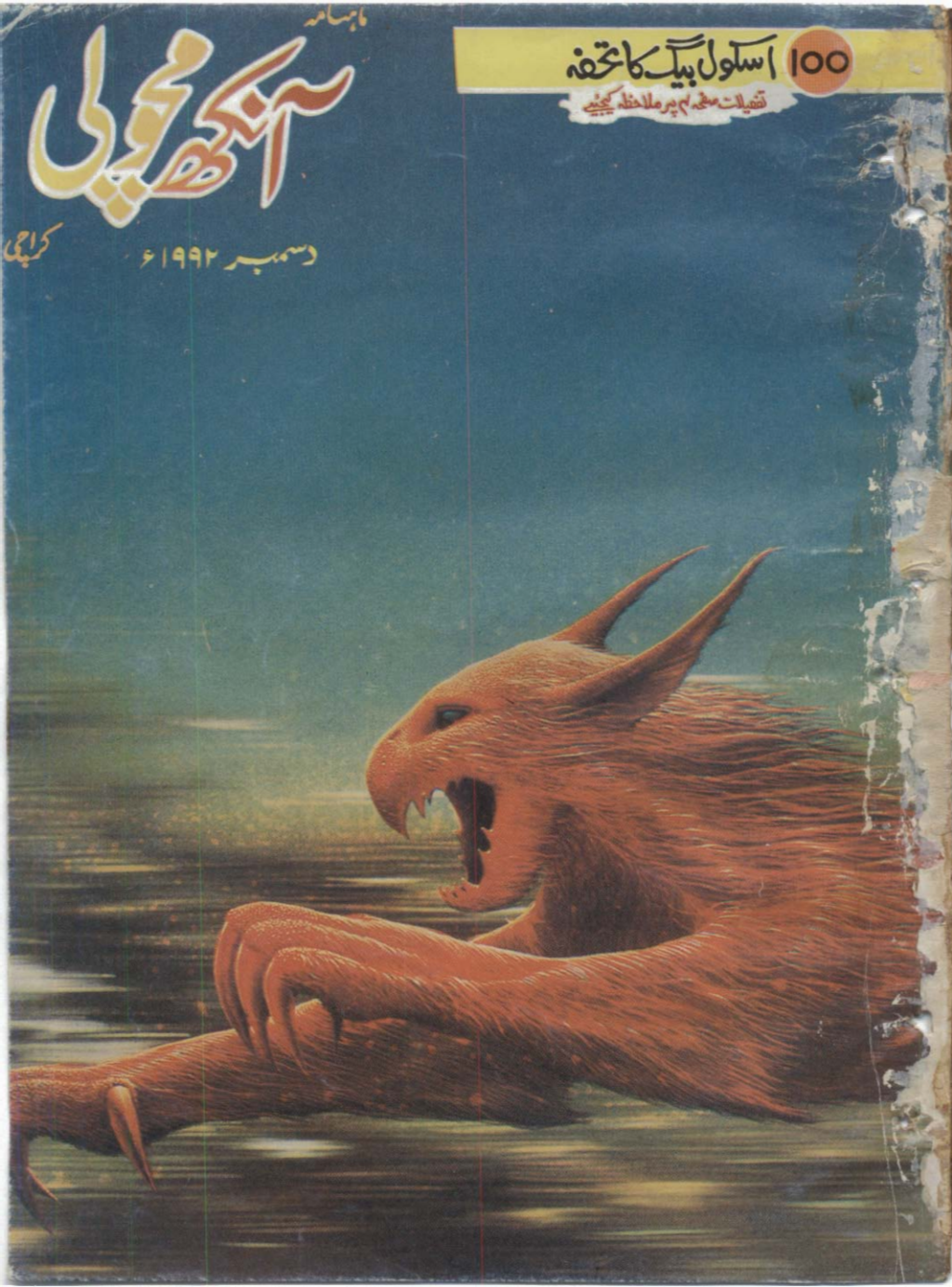

نیا
بلوبینڈ
مارجرین
Blue Band
WITH VITAMIN A&D
MARGARINE
لذّت کے ساتھ... صحت بھی!

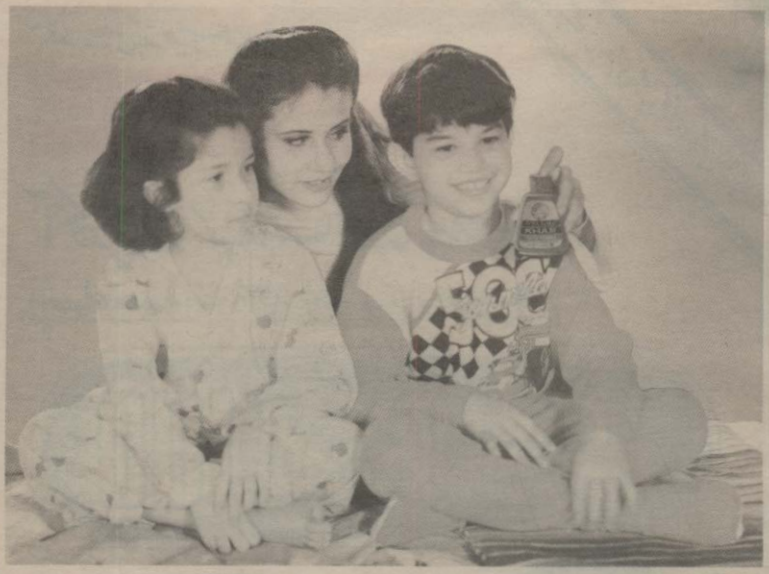

عام ٹوتھ پاؤڈر نہ نہ نہ
خاص ٹوتھ پاؤڈر ہاں بھئی ہاں

ٹچ می خاص۔ جدید ترین فارمولے
پر بنا، پاکستان کا واحد ٹوتھ پاؤڈر ہے
جس میں لونگ فلورائیڈ اور
نمکیات ایک ساتھ شامل ہیں۔

ٹچ می خاص کی خوبیاں
عام ٹوتھ پاؤڈر میں کہاں

ٹچ می خاص
ٹوتھ پاؤڈر

LASER DOT

interflow

کوپن بھیجنے کی آخری تاریخ ۳۱ دسمبر ۱۹۹۲ء

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ

تحفہ دیا کرو کہ تحفے سے محبت بڑھتی ہے

آنکھ مچولی کو اپنے ساتھیوں سے محبت ہے؛

اِسی لیے **تحفہ** دینا آنکھ مچولی کی روایت ہے؛

100 اسکول بیگ

کا تحفہ

لیکن

یہ تحفے صرف ان ساتھیوں کے لیے ہیں جن کے پاس اسکول بیگ نہیں ہیں یا ناقابل استعمال ہیں۔ آنکھ مچولی کو اپنے ساتھیوں کی دیانت داری پر اعتماد ہے۔ اُمید ہے تحفے کا کوپن صرف وہی ساتھی بھیجیں گے جنھیں اسکول بیگ کی ضرورت ہوگی

کوپن برائے تحفہ

نام _____ ولدیت _____

کلاس _____ اسکول کا نام _____

پتا _____

کوپن بھیجنے کا پتا: ماہنامہ آنکھ مچولی ○ ۱-پی آئی بی کالونی ○ کراچی ۵

نئی نسل کے ادب کا بین الاقوامی معیار

ماہنامہ

آنکھ مچولی

کراچی

جلد ، شمارہ ۶ جمادی الثانی/رجب ۱۴۱۳ھ دسمبر ۱۹۹۲ء

آڈٹ بیورو آف سرکولیشن سے
تصدیق شدہ اشاعت
رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی

مدیر اعلیٰ
ظفر محمود شیخ
مدیر مسئول
ایم اے فاروقی
مشاورت
مشفق خواجہ امجد اسلام امجد
مدیر اعزازی
طاہر مسعود
مجلس ادارت
منیر احمد راشد، محمد عمر احمد خان

• ماہنامہ آنکھ مچولی میں شائع ہونے والی تمام تحریروں کے جملہ حقوق بحق ادارہ محفوظ ہیں، پیشگی اجازت کے بغیر کوئی تحریر شائع نہیں کی جا سکتی۔
• ماہنامہ آنکھ مچولی میں شائع ہونے والی قرآن و حدیث پر مبنی تحریروں کے علاوہ کہانیوں کے کردار و واقعات فرضی ہیں کسی اتفاقیہ مماثلت کی صورت میں ادارہ ذمہ دار نہ ہوگا
• ماہنامہ آنکھ مچولی کو گرین گائیڈ اکیڈمی نے ضمیر الدین میموریل آرگنائزیشن کے زیر سرپرستی بچوں کی ذہنی اور علمی صلاحیتوں میں اضافے اور سیرت و کردار کی تعمیر کیلئے شائع کیا

خط و کتابت کا پتہ : ماہنامہ آنکھ مچولی، گرین گائیڈ اکیڈمی ۱۰-پی آئی بی کالونی، کراچی ۵ ۷۴۸۰۰ فون : ۱۵۰۶۰

ناشر : ظفر محمود شیخ طابع : زاہد علی مطبع : لاریب پرنٹنگ پریس، ایم اے جناح روڈ۔ کراچی

قیمت دس روپے
۷ درہم، ۷ ریال

جی ہاں! آنکھ مچولی کا مقابلہ آنکھ مچولی ہی سے ہے

اپنی روایات کو ہم خود ہی آگے بڑھاتے ہیں

کرکٹ اسپیشل، قہقہہ نمبر، خوفناک نمبر، حیرتناک نمبر، اطفال نمبر، عالمی ادب نمبر اور کشمیر نمبر

کے بعد اب

آنکھ مچولی کی ایک نئی اور انوکھی پیش کش

جنوری ۹۳ء میں منظرِ عام پہ آرہا ہے

ایجادات نمبر

قیمت = ۱۸ روپے

روئے زمین پر انسان نے آج تک جتنی اہم چیزیں ایجاد کی ہیں ان کی دلچسپ حیرت انگیز اور سچی کہانیاں

سائنس کی سائنس، کہانی کی کہانی

یہ چیزیں کیسے ایجاد ہوئیں؟

پہیہ، انجن، بلب، کاغذ، ریل گاڑی، ہوائی جہاز، ٹیلی فون، ٹیلی گراف، کار، ریڈیو، ٹیلی وژن، راکٹ، ایٹمی بجلی گھر، دوائیں، اور دیگر اشیاء —

خصوصی شمارہ میں پڑھیے

لفظ لفظ تحقیق — حرف حرف حقیقت

آپ بھی لکھیے

اگر آپ کسی سائنسی ایجاد کی کہانی لکھنا چاہیں تو ضرور لکھیے — لیکن جس کتاب سے معلومات حاصل کریں اس کا حوالہ دینا نہ بھولیے

ہر قابلِ اشاعت تحریر کا معاوضہ دینا آنکھ مچولی کی روایت ہے

حسنِ ترتیب

۸ — تاریخ کے دریچے سے — ادارہ
۹ — ماہِ رواں کی پہلی بات — اداریہ
۱۰ — حمدِ باری تعالیٰ (نظم) — فضل ربی راہی
۱۱ — اللہ کی تلوار — مختار احمد
۱۵ — اپنے قدموں تلے جنّت والی — اعجاز احمد فاروقی
۲۱ — محسنِ انسانیتؐ — منیر احمد راشد
۲۶ — قائدِ اعظم
۲۸ — غبارے والا (نظم) — امان اللہ نیّر شوکت
۲۹ — شکر اور شکریہ — پروفیسر عنایت علی خان
۳۲ — لقمے پر کیا بیتی؟ — حماد خالد فیاضی
۳۴ — کھیر کس نے کھائی؟ — اشتیاق احمد
۳۹ — درِ حیرت — ایاز محمود
۴۲ — ہیں بہاریں جن کے دم سے — وسیم بن اشرف
۴۶ — تصویری کہانی — ادارہ
۴۸ — ہمارے قائد (نظم) — عبدالقادر
۴۹ — کمپیوٹر انسان کا عظیم خدمتگار — شاہد شیخ
۵۲ — جو ہوگا خود دیکھ لے گا — علی جبران
۵۵ — گُدگُدے — لطائف
۵۹ — بحیرۂ مردار — عمر غلام نبی
۶۰ — یہ ہے زندگی — کاشف شہزاد
۶۵ — لیو کاؤنٹ ٹالسٹائی — محمد سلمان خان سنبل
۶۷ — امتحان ہے آپ کی ذہانت کا — ادارہ
۶۹ — بادل، ہوا اور شہزادی — سید نظر زیدی
۷۶ — بوجھو تو جانیں — ادارہ
۸۰ — دو دوست (نظم) — مجاہد حسین باسط
۸۱ — ہم موت سے نہیں ڈرتے — باقر عالم
۸۳ — سیارے ایک جیسے کیوں نظر آتے ہیں — نگہت آرا چوہان
۸۵ — بخدمت جناب — خطوط کے جواب
۸۹ — میمی کو دادا ابا مل گئے — محمد عمر احمد خان
۹۷ — گمشدہ — مکیش کمار
۹۹ — سب ٹھیک ہے — فرزانہ روحی
۱۰۴ — کرشمہ — اظہر نیاز
۱۱۲ — چیزوں کی کہانی — آصف فرخی
۱۱۵ — چڑا ہاہا اور لومڑی گرے کی کہانی — امتیاز جلیل
۱۱۹ — قلم قتلے — مختصر تحریریں
۱۳۲ — ساتھی بچپن کے — تعارف

تاریخ کے دریچے سے

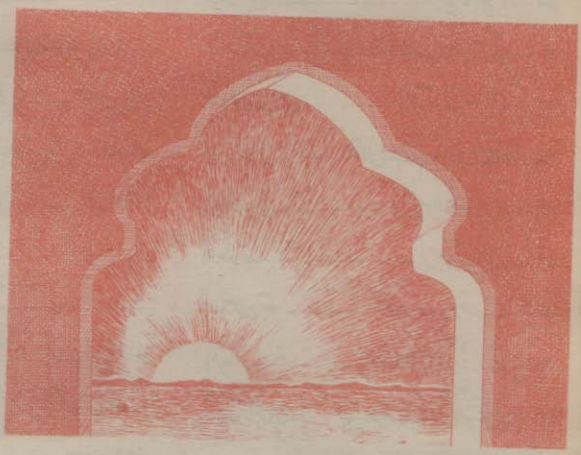

حضرت علیؓ دشمنوں میں گھرے ہوئے نہایت بہادری سے لڑ رہے تھے۔ اچانک ایک شخص نے ان پر حملہ کیا۔ حضرت علیؓ سنبھلے اور جوابی حملے کے طور پر آپ نے ایسا وار کیا کہ دشمن کی تلوار ٹکڑے ٹکڑے ہو کر گر پڑی۔ اب دشمن نہتا سامنے تھا۔ حضرت علیؓ نے اسے غیر مسلح دیکھ کر اپنا ہاتھ روک لیا۔ دشمن بھی کم نہیں تھا۔ سراسیمہ ہو کر بھاگا نہیں بلکہ حضرت علیؓ سے کہنے لگا:

"مجھے تلوار دو میں اب بھی مقابلے کے لئے تیار ہوں۔"

حضرت علیؓ نے فوراً اپنی تلوار اس کے حوالے کر دی اور خود غیر مسلح ہو گئے۔ دشمن ہکا بکا رہ گیا۔ کچھ دیر تک ساکت کھڑا رہا۔ پھر حیرت سے بولا۔

"ارے ۔۔۔ آپ نے اپنی تلوار مجھے بخش دی اور خود نہتے ہو گئے؟"

حضرت علیؓ نے جواب دیا "اور کیا کرتا۔ آج تک کبھی ایسا نہیں ہوا کہ کوئی شخص مجھ سے کچھ مانگے اور میں انکار کر دوں۔"

دشمن مغلوب ہو گیا۔ کہنے لگا "میں اس جرأت اور شرافت کے سامنے سر جھکاتا ہوں۔"

ماہِ رواں کی پہلی بات

انسان تین چیزوں کا مجموعہ ہے جسم، ذہن اور روح۔ ان تینوں چیزوں کے اپنے اپنے تقاضے ہیں۔ مثلاً جسم کی ضرورت یہ ہے کہ اس کو صحت بخش غذا فراہم کی جائے اور اسے تندرست رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی جائے۔ اسی طرح ذہن کو ترقی دینے کے بھی کچھ طریقے ہیں۔ ان میں ایک معروف طریقہ یہ ہے کہ اچھی کتابوں کا مطالعہ کیا جائے۔ غور و فکر کیا جائے اور اسے زیادہ سے زیادہ استعمال میں لایا جائے۔ جسم اور ذہن کی طرح روح کے بھی اپنے مطالبات ہیں۔ خدا کی عبادت اور بندوں کے حقوق پورے کرنے سے روح مطمئن رہتی ہے۔ نیکی، ایثار و قربانی، فیاضی اور دوسروں کو فائدہ پہنچانے سے روح کو خوشی اور اطمینان حاصل ہوتا ہے۔

ایک متوازن اور کامیاب انسان وہی ہے جس کے جسم، ذہن اور روح تینوں میں اعتدال اور ہم آہنگی ہو۔ وہ جسمانی طور پر صحت مند اور چاق و چوبند ہو۔ ذہنی لحاظ سے بیدار، توانا اور تعمیری خیالات کا حامل ہو۔ روحانی اعتبار سے مطمئن اور آسودہ ہو۔ عام طور پر ایسا بہت کم ہوتا ہے۔ جن لوگوں کی توجہ اپنی جسمانی ضرورتوں کی طرف رہتی ہے وہ اپنے ذہن اور روح کے تقاضوں کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ بالکل اسی طرح ذہنی کام کرنے والے اپنی صحت کی طرف سے لاپروا ہو جاتے ہیں..... یہ ٹھیک بات نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کے اندر بے شمار قوتیں رکھ دی ہیں۔ ان قوتوں سے ہم اسی وقت فائدہ اٹھا سکتے ہیں جب ہم ان کی حقیقت کو سمجھیں اور ان کی نشوونما پہ توجہ دیں۔

جسم، ذہن اور روح کو بیک وقت ترقی دینا کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ آپ اپنے روزمرّہ کے معمولات اس انداز میں بنا سکتے ہیں کہ اس میں تینوں چیزوں کے لئے گنجائش نکال لیں..... مثلاً کھیل کود اور ورزش سے صحت بہتر ہوتی ہے، مطالعے اور مشاہدے سے ذہن کے بند دریچے کھلتے ہیں اور عبادت کے علاوہ دوسروں کے کام آنے اور ان کی مدد کرنے سے سچی خوشی میسّر آتی ہے تو پھر ہمیں اس کا خیال رکھنا چاہئے کہ ہر روز ہم تینوں کاموں کے لئے وقت نکالیں..... اور انھیں اپنی عادت میں شامل کر لیں..... یقین مانئے..... آپ تھوڑے ہی عرصے میں اپنے آپ کو بدلا ہوا انسان پائیں گے۔ ایک ایسا انسان جو اپنے لئے بھی مفید ہے اور معاشرے کے لئے بھی اور جسے خدا کی خوشنودی بھی حاصل ہوگی۔

آپ کا دوست
ظفر محمود شیخ

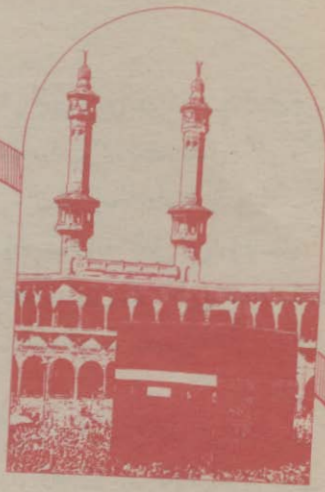

حمدِ باری تعالیٰ

فضل ربی راہی

تیری رحمتوں کا سہارا ہے ہم کو
ہر اک شے سے بڑھ کر تو پیارا ہے ہم کو
زمیں میں، فضا میں تیری داستاں ہے
سمندر کی موجوں میں تو ہی عیاں ہے
یہ چاند اور سورج، یہ روشن ستارے
یہ نورِ ازل سے منوّر شرارے
یہ پھول اور خوشبو، یہ آہو، یہ جگنو
تیری ذاتِ واحد نمایاں ہے ہر سُو
گل و یاسمیں تیرے دم سے معطّر
ہوائے چمن تیرے دم سے معنبرؔ
وہ جنگل ہے یا کوئی کھیتی ہری ہے
سبھی میرے خالق کی کاری گری ہے
یہ دنیا ہے فانی، ہیں سب اس میں راہیؔ
جو باقی ہے وہ ذات، تُو ہے الٰہی

معنبر۔ خوشبودار

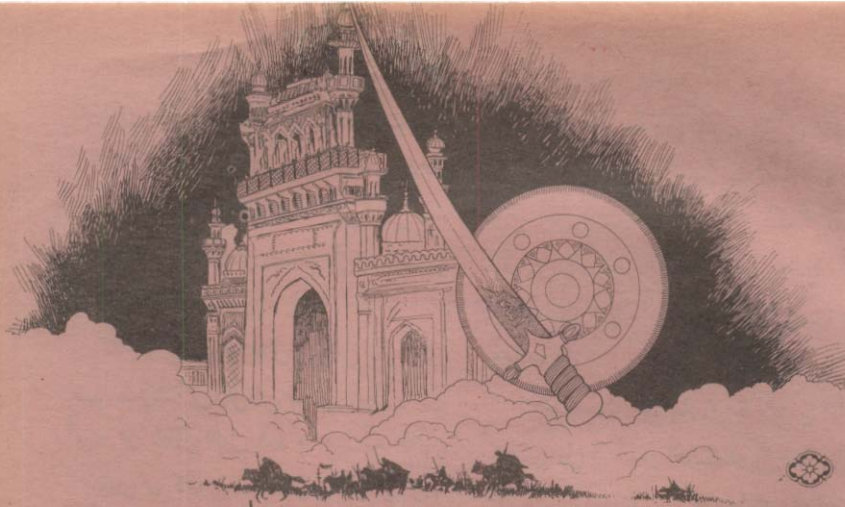

اللہ کی تلوار

مختار احمد

تاریخِ اسلام عظیم مسلمانوں اور مجاہدوں کے کارناموں سے بھری پڑی ہے۔ اس میں جہاں علی المرتضیٰ اور سید الشہدا حمزہؓ کا ذکر ملتا ہے وہاں خالدؓ بن ولید کا نام بھی روشن نظر آتا ہے حضرت خالدؓ بن ولید مجاہدینِ اسلام کے سرتاج تھے جنہوں..... نے دینِ حق کی خاطر جو بھی لڑائی لڑی، اس میں فتح و کامیابی پائی۔ آیئے آج اس عظیم بہادر مسلمان جرنیل کی زندگی کے اوراق پلٹتے ہیں۔

آپ کا تعلق خاندانِ قریش کی شاخ بنی مخزوم سے تھا۔ آپ کے والد ولید بن مغیرہ، رئیسانِ قریش میں نمایاں مقام رکھتے تھے اور قریش کے سواروں کے دستے کے سپہ سالار تھے۔ ان کا انتقال ہجرت نبیؐ کے پہلے سال بمطابق ۶۲۳ء میں ہوا۔ ولید بن مغیرہ نے اسلام قبول نہ کیا۔ ولید کی وفات کے بعد اس کا بیٹا "خالد" باپ کے منصب پر فائز ہوا۔ یعنی سواروں کے دستے کے سپہ سالار مقرر ہوا۔ جنگ احد ۳ھ میں (اس وقت خالد نے اسلام قبول نہیں کیا تھا) اسی دستے کی کوششوں سے کفار کے اکھڑے ہوئے پاؤں دوبارہ جم گئے تھے۔ خالد نے پہاڑی درے کو خالی پاکر عقب سے مسلمانوں پر حملہ کیا تو مسلمانوں کو سخت نقصان اٹھانا پڑا۔

۵ھ کے غزوۂ احزاب (خندق کا معرکہ) میں بھی "خالد" قبائل عرب کے اتحادی فوجوں کے سواروں کے دستے کے سالار تھے۔

قبولِ اسلام۔ ۶ھ میں جب آنحضرتؐ نے کفارِ مکہ سے صلح حدیبیہ کا معاہدہ کیا اور ملک

میں امن و سکون کا دور شروع ہوا تو حضرت خالد کو اسلام کی طرف رغبت ہوئی۔ چنانچہ مکہ سے نکل کر مدینہ طیبہ کا رخ کیا، بارگاہ نبویؐ میں حاضر ہوئے، اور دولت ایمان سے مالا مال ہوئے۔ یہ اواخر ۷ھ کا واقعہ ہے۔

حضرت خالدؓ نے اسلامی فوج میں شامل ہو کر سب سے پہلے جس لڑائی میں حصہ لیا، وہ جنگِ موتہ تھی۔ جو جمادی الاول ۸ھ کو موتہ کے مقام پر مسلمانوں اور کافروں کے درمیان لڑی گئی تھی۔ اس لڑائی میں حضورؐ شریک نہ ہو سکے تھے۔ چنانچہ آپؐ نے حضرت زیدؓ بن حارثہ کو امیرِ لشکر مقرر فرمایا اور فرمایا کہ اگر زیدؓ شہید ہو جائے تو جعفرؓ بن ابی طالب تمہارے سپہ سالار ہونگے اگر وہ بھی شہید ہو گئے تو عبداللہؓ بن رواحہ تمہارے امیر ہوں گے اگر وہ بھی شہید ہو جائیں تو پھر تمہاری مرضی جسے اپنا سالار بنانا چاہو بنا لینا۔

اس جنگ میں مسلمان تین ہزار تھے۔ جبکہ کفار کی تعداد ایک لاکھ سے بھی زیادہ تھی۔ تاہم لڑائی شروع ہوئی تو رسول اللہ کے مقرر کردہ سپہ سالارانِ اسلام ایک ایک کر کے شہید ہوئے تو مسلمانوں نے متفقہ طور پر حضرت خالدؓ کو اپنا قائد منتخب کر لیا۔ حضرت خالدؓ نے پہلی مرتبہ لشکرِ اسلام کا پرچم اپنے ہاتھ میں لیا، اور اس بہادری سے لڑے کہ دشمن بھاگ اٹھا۔ "اس لڑائی میں حضرت خالدؓ نے اس زور سے تلواریں چلائیں کہ آٹھ تلواریں ان کے ہاتھ سے ٹوٹ کر گریں۔"

"اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعے نبی کریمؐ کو اس فتح کی خبر دی" تو آپؐ نے فرمایا، "پھر اللہ کی ایک تلوار (خالدؓ) نے مسلمانوں کے علم کو اپنے ہاتھ میں لیا اور اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو اپنے دشمن پر غلبہ عطا فرمایا۔" (بخاری شریف۔ باب غزوۂ موتہ)

حضرت خالدؓ کی بہادری کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان کوئی بڑا نقصان اٹھائے بغیر صحیح و سالم واپس ہوئے۔ اس بہادری پر بارگاہِ رسالت سے حضرت خالدؓ کو "سیف من سیوف اللہ" یعنی "اللہ کی تلواروں میں سے ایک تلوار" کا لقب عطا ہوا۔

○ ..... فتح مکہ کے موقع پر حضرت خالدؓ ایک فوجی دستے کے سپہ سالار بن کر حضورؐ کے سامنے سے گزرے تو آپؐ نے پوچھا "کون ہے؟" لوگوں نے عرض کیا "خالدؓ ہیں۔" آپؐ نے فرمایا "خدا کی تلوار ہے۔" (ترمذی، بابِ مناقب)

○ ..... غزوۂ حنین کے موقع پر حضورؐ نے حضرت خالدؓ کو فتح مکہ کے نو مسلم نوجوانوں پر مشتمل ہراول دستے (مقدمتہ الجیش) کا سالار مقرر فرمایا تھا۔

○ ..... غزوۂ طائف میں حضورؐ نے حضرت خالدؓ کو طائف کا محاصرہ کرنے کے لئے سب سے پہلے روانہ فرمایا۔ غزوۂ تبوک میں بھی حضورؐ نے حضرت خالدؓ کو لشکرِ اسلام کے ہراول دستے کا سالارِ اعلیٰ مقرر فرمایا تھا۔

یہ تو تھیں عہدِ نبویؐ میں حضرت خالدؓ کی عسکری زندگی کی جھلکیاں..... اس کے بعد عہدِ خلافت راشدہ میں بھی انہوں نے کارہائے نمایاں انجام دئے ..... چند ایک کا ذکر درجِ ذیل ہے۔

○ ..... حضرت ابو بکرؓ صدیق کے عہدِ خلافت میں جب جھوٹے مدعیانِ نبوت اور منکرینِ زکوۃ نے سر اٹھایا تو ان کی سرکوبی کے لئے جانے والی اسلامی افواج کا سپہ سالارِ اعلیٰ حضرت خالدؓ کو مقرر کیا گیا۔ آپؓ ایک بھاری جمعیت کے ساتھ اس مہم پر گئے اور تھوڑے ہی عرصہ بعد شرپسندوں کا قلع قمع کرنے میں کامیاب ہوئے۔

○ ..... حضرت خالدؓ ابھی مرتدین کی سرکوبی سے فارغ ہوئے ہی تھے کہ عراقی سرحد پر مسلمانوں اور ایرانیوں کے درمیان جنگ چھڑ گئی۔ (واضح رہے کہ اس وقت عراق، ایران کے ماتحت تھا) مسلمانوں کے امیرِ لشکر حضرت مثنیٰ بن حارثہ تھے۔ حضرت ابو بکرؓ نے حضرت خالدؓ کو حکم دیا کہ فوراً مثنیٰ کی مدد کو پہنچیں۔ حضرت خالدؓ نے محاذ پر پہنچتے ہی اس شدت سے حملہ کیا کہ آتش پرستوں کو پیچھے دھکیلتے ہوئے عراق کے حدود میں گھس گئے اور بانقیا، کسکر اور حیرہ کے تمام اضلاع فتح کئے۔

○ ..... ملک عراق پر حملہ کے ساتھ ہی ملک شام کی سرحد پر رومیوں اور حضرت عمرؓ و بن العاص کی اسلامی فوجوں کے درمیان جنگ شروع ہو چکی تھی۔ حضرت خالدؓ، جو اس وقت سرحد عراق پر اسلامی سپاہ کی قیادت کر رہے تھے، کو دربار خلافت سے فرمان موصول ہوا کہ "عراق کو مثنیٰ کی نگرانی میں چھوڑ کر اپنے لشکر کے ہمراہ مسلمانوں کی مدد کے لئے شام کی سرحد پر پہنچنے کی کوشش کریں۔"

چنانچہ حضرت خالدؓ اپنے لشکر کو لے کر شام کی طرف مڑ گئے۔ راستے میں کفار کی فوجی ٹولیاں جگہ جگہ ملیں، ان کو شکست دیتے ہوئے شام کی سرحد پر اسلامی فوج سے مل گئے۔ آپؓ کے آنے سے اسلامی افواج کے حوصلے بلند ہو گئے اور مزید انتظار کئے بغیر شام کے پایۂ تخت دمشق کا محاصرہ کر لیا گیا اور کچھ دنوں بعد اسے فتح کر لیا گیا۔

آپ نے قبولِ اسلام کے بعد اپنی پوری طاقت میدانِ جہاد میں صرف کر دی۔ آخر عمر میں علیل ہو گئے اور ۲۱ھ بمطابق ۶۴۳ء کو اس دارِ فانی سے کوچ کر گئے۔ حضرت خالدؓ میں حصولِ شہادت کا جذبہ کس قدر موج زن تھا۔ اس کا اندازہ ان کی وفات سے کچھ دیر قبل کی باتوں سے لگایا جا سکتا ہے۔

○ ..... ایک صحابی (غالباً) حضرت ابو سعیدؓ خدری، حضرت خالدؓ کی عیادت کو آئے ہوئے تھے۔ حضرت خالدؓ بسترِ علالت پر پڑے رو رہے تھے، یہاں تک کہ داڑھی مبارک تر ہو گئی تھی۔ حضرت ابو سعیدؓ خدری نے فرمایا، "خالدؓ! اس قدر غم کیوں منا رہے ہو؟" حضرت خالدؓ نے فرمایا "دوست! میں نے اسلام لانے کے بعد اپنی

پوری زندگی میدانِ جہاد میں گزار دی۔ لیکن افسوس کہ میں..... شہادت کی موت مرنے سے رہا..... اور اب عورتوں کی طرح گھر ہی میں جان دے رہا ہوں۔" حضرت ابو سعیدؓ نے کہا، "میرے دوست! غم کرنے کی کیا ضرورت ہے!..... شہادت کا درجہ تو تجھے مل چکا ہے، تمہیں یاد نہیں رہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تمہیں "اللہ کی تلوار" کا لقب عنایت فرمایا تھا؟..... اور اللہ کی تلوار کو بھی بھلا کوئی توڑ سکتا ہے؟"

حضرت ابو سعیدؓ خدری کی ان باتوں سے حضرت خلدؓ کے شہید نہ ہونے کی وجہ بھی معلوم ہو جاتی ہے کہ حضرت خالدؓ کو رسول اللہ نے چونکہ "اللہ کی تلوار" کا لقب دیا تھا اس لئے ان کی شہادت کا مطلب یہ ہوتا کہ "اللہ کی تلوار" ٹوٹ گئی! (نعوذ باللہ) آج عالمِ اسلام مصائب سے دوچار ہے۔ ایک طرف فلسطین ظلم و بربریت کا شکار ہے تو دوسری طرف کشمیر معصوم مسلمانوں کی آہوں اور سسکیوں میں ڈوبا ہوا ہے اور تیسری ایسے حالات میں اللہ، رب العالمین سے دعا ہے کہ دینِ حق کو ایسے ہی نڈر اور بیباک مجاہد مل جائیں جو خالدؓ بن ولید کی یاد تازہ کر سکیں اور امتِ محمدیؐ کو اسلام کے دشمنوں کے پنجوں سے آزادی دلا سکیں۔ (آمین)

قیمتی کیمرے کا دوسرا تحفہ کسے ملا؟

اکتوبر ۱۹۹۲ء میں قیمتی کیمرے کے تحفے کا اعلان کیا گیا تھا۔ تحفہ ایک تھا اور کوپن بھیجنے والے بے شمار۔ سو اس کے لئے قرعہ اندازی کا طریقہ اختیار کیا گیا جس خوش قسمت کا نام نکلا — وہ ہیں

جناب بشیر احمد چنہ

جام محمد نواز محلہ ضلع سکھر

ادارہ اپنے خوش نصیب ساتھی کو مبارکباد پیش کرتا ہے۔

ان کی خدمت میں کیمرے کی امانت جلد بھیج دی جائے گی۔

اپنے قدموں تلے جنت والی

اعجاز احمد فاروقی

آدھی رات اِدھر، آدھی رات اُدھر سوئے سنسار جاگے پاک پروردگار۔

سنسار کے ساتھ عبداللہ بھی سو رہا تھا پھر معلوم نہیں کیسے اس کی اچانک آنکھ کھُل گئی۔ رات کا پچھلا پہر تھا۔ کائنات کا شور شرابا سویا ہوا تھا۔ اس کے کمرے میں ایک مدھم سا چراغ جل رہا تھا۔ معلوم نہیں عبداللہ کو لیٹے لیٹے کیسے احساس ہوا کہ اس کے کمرے میں کوئی اور بھی ہے۔ اس کا احساس کر کے وہ یکبارگی اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس کے کمرے میں مصلی پر کوئی حور بیٹھی ہوئی تھی۔

عبداللہ اس کو دیکھ کر کچھ حیران تو ہوا، ڈرا نہیں، گھبرایا نہیں اور بوکھلایا بھی نہیں۔ ویسے حور کے مقدس حسن نے اس کو دم بخود کر دیا تھا اور وہ اس کو دیکھ رہا تھا لیکن ٹکٹکی باندھ کر نہیں دیکھ پا رہا تھا۔

پھر مصلی نشین حور نے اس کو مسکرا کر دیکھتے

ہوئے پوچھا

"عبداللہ کیسے ہو؟"

عبداللہ نے محسوس کیا کہ اس کی جملہ بیماریاں اس حور کی شافی مسکراہٹ نے ختم کر دی ہیں۔ اس نے بے اختیار ہو کر کہا "میں بالکل ٹھیک ہوں۔ ٹھیک ہو گیا ہوں۔ آپ کون ہیں؟"

"میں حور ہوں۔"

"آپ کب سے یہاں ہیں؟"

"تمہاری پیدائش سے قبل سے میں یہاں ہوں۔"

یہ سن کر عبداللہ دنگ رہ گیا کہ یہ حور تو گویا گزشتہ تیس برس سے یہاں ہے۔

"اب آپ ہمیشہ یہیں رہیں گی، میرے پاس؟"

"نہیں ہمیشہ رہنے والی تو اللہ کی ذات ہے جب تک مجھے یہاں رہنے کی اجازت اور مہلت میسر ہے تو میں یہیں رہوں گی۔ البتہ میں کل جا رہی ہوں۔"

"کہاں! کہاں! کیوں! کیوں!؟" عبداللہ نے مضطرب ہو کر پوچھا۔

"میں ذرا تمہاری ہمشیرہ کے پاس جا رہی ہوں وہ بیمار ہے۔"

"آپ اس کو بھی جانتی ہیں کیا؟"

"ہاں میں اس کی بھی نگران ہوں اور تمہاری بھی۔"

یہ سن کر عبداللہ اٹھا اور الماری سے کچھ کپڑے کچھ کھلونے اور ایک ہزار روپیہ نکالا۔

"یہ مریم کو دے دیجئے گا۔ میرا اسلام بھی کہئے گا میں بیماری کی وجہ سے اس سے ملنے نہیں جا سکا اور اس کو اپنی بیماری کا بھی نہیں بتایا خواہ مخواہ وہ پریشان ہوتی۔"

"اچھا کیا تم نے۔ تم یوں بھی بہت اچھے ہو۔"

"میں اس لئے اچھا ہوں کہ آپ بہت اچھی ہیں۔ یہ میری الماری، کتابیں، کپڑے، اخبار سب آپ نے ٹھیک کئے ہیں؟ یہ کیا آپ قرآن شریف پڑھ رہی ہیں؟"

حور نے سب باتوں کا جواب اثبات میں دیا تو عبداللہ ممنون ہو کر خوش ہو گیا اور خوش ہو کر پھیل گیا اور سوچنے لگا کہ یہ حور تو سُکھ ہی سُکھ ہے، چین ہی چین ہے، کرم ہی کرم ہے، رحمت ہی رحمت ہے۔ اس کے بغیر تو زندگی اجیرن اور دوبھر ہو جاتی ہے۔ یہ ایک نعمت نہ ہوتی تو وہ اپنی اس بیماری کے ہاتھوں گزر گیا ہوتا۔ پھر اس کو خیال آیا کہ آخر مجھ پر اتنی مہربان کیوں ہے؟ میں نے تو اس کے لئے کچھ نہیں کیا اس نے میرے لئے سب کچھ ہی کیا ہے۔ اس احساس نے اس کے دل کو اور زیادہ گداز کر دیا اور اس نے عقیدت اور محبت سے سرشار ہو کر اس کو دیکھنا شروع کیا۔ حور بھی اس کو دیکھ دیکھ کر مسکرا رہی تھی اور مسکرا مسکرا کر دیکھ رہی تھی۔

عبداللہ اس کی مسکراہٹ کو دیکھ ہی نہیں رہا تھا

بلکہ محسوس بھی کر رہا تھا اور کوئی اس کے اندر ہی اندر بڑی شیریں آواز میں پوچھ رہا ہے۔

"اور تم خدا کی کون کون سی نعمتوں کو جھٹلاؤ گے؟"

پھر جیسے اس کا دل بھر آیا اور وہ پگھل گیا۔ پگھل کر اس نے پوچھا

"یہ میری بیماری کے دوران آپ پودینے کی چٹنی کے ساتھ روٹی کھاتی رہی ہیں اور مجھے پھل فروٹ کھلاتی رہی ہیں؟"

"ہاں"

"کیوں؟"

"بس یوں ہی، بس اب تم سوجاؤ صبح تمہیں کام پر بھی جانا ہے۔"

"آپ نے میری صحت کے لئے دعا کی تھی؟"

"ہاں کی تھی۔"

"آپ ہی کی دعائیں قبول ہوئی ہیں اب میں نہ بیمار ہوں اور نہ کم زور ہوں، آپ سوجائیں۔"

"میں تو سوتے میں بھی جاگتی رہتی ہوں تم میری فکر مت کرو۔"

"میں آپ کی فکر نہ کروں تو دونوں جہانوں میں دھتکارا جاؤں۔"

"تم نے میرا مان بڑھا دیا ہے، اللہ تمہیں خوش رکھے۔"

"آپ ہی نے مجھے اللہ تک پہنچایا ہے، میں آپ کو خوش رکھوں تو اللہ بھی مجھے خوش رکھے گا۔" یہ سن کر حور سر جھکا کر زیر لب کچھ دعائیں پڑھنے لگی۔ یہ دیکھ کر عبداللہ اور زیادہ پگھل گیا اور پگھلتے ہوئے محسوس کرنے لگا

"یہ حور ہے تو ایثار ہے، یہ حور ہے تو انسانیت ہے زندگی ہے، ہمت ہے ولولہ ہے، جوش ہے خیر خواہی ہے۔ یہ نہ ہو تو کوئی اسمٰعیلؑ نہ ہو، کوئی حسینؓ نہ ہو، کوئی عبدالقادر جیلانیؒ نہ ہو، کوئی بایزید بسطامیؒ نہ ہو، یہ نہ ہو تو کوئی بھی موسیٰؑ کو نیل میں ڈال کر اس کے پیچھے پیچھے نہ جائے۔ پھر وہ پگھلتے پگھلتے ایسا پگھلا کہ سو گیا۔

دوبارہ جب اس کی آنکھ کھلی تو کمرے میں دھوپ پھیلی ہوئی تھی اس کا ناشتہ میز پر سجا ہوا تھا۔ اس نے اٹھ کر ماں کو آواز دی پھر کمرہ کمرہ اس کو تلاش کیا مگر وہ وہاں نہیں تھی۔

تب اس پر کھلا کہ جسے وہ حور سمجھ رہا تھا وہ اس کی ماں ہی تو تھی۔

عقل مند

○ ..... کچھ نہ کچھ عیب تو ہر انسان میں ہوتے ہیں۔ عقلمند انسان وہ ہوتا ہے جو اپنے اندر پائے جانے والے عیب کو خود محسوس کر لیتا ہے اور اس کے عیب کو دنیا محسوس نہیں کرتی۔ بے وقوف انسان اپنے عیب کو خود محسوس نہیں کرتا بلکہ اس کے عیب کو دنیا محسوس کرتی ہے۔

آدابِ سفر

اپنے عزیزوں کو لینے یا رخصت کرنے
جب بھی آپ ریلوے سٹیشن آئیں تو
پلیٹ فارم ٹکٹ لینا نہ بھولیں ہو سکتا
ہے کہ بعد میں آپ کو پریشانی کا سامنا کرنا
پڑے

ایک قابل اعتماد نام پاکستان ریلوے

محکمہ تعلقات عامہ

حادثے ایک دم بھی ہوتے ہیں!

برقی سواری تیز رفتاری سے دوڑتے دوڑتے اچانک حادثے کا شکار ہو گئی۔ اس کے گرنے کے مختلف منظروں کو ۷۸ سالہ بوڑھے نے اپنے کیمرے میں محفوظ کر لیا۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ اس حادثے میں کوئی بھی ہلاک نہیں ہوا۔ مسافروں کے گرنے اور سڑک پر زخمی ہونے کی تصویریں آپ دیکھ سکتے ہیں۔ اسے کہتے ہیں جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے۔

2

3

4

5

آنکھ مچولی تقریری مقابلۂ سیرت النبیؐ کی ٹرافی اور انعامات

اسٹیج پر ظفر محمود شیخ، ڈاکٹر اختر سعید، اسرار احمد شمسی اور طاہر مسعود

ایک طالب علم مقررہ کسی نکتے کی وضاحت

ڈی ایم ایس اسکول کے احمد ویس، اسکول یونیفارم میں

ایک طالبہ، اظہار خیال کرتے ہوئے

آغا خان اسکول کھارادر کے طلعت اقبال
دوسرا انعام وصول کرتے ہوئے

عائشہ باوانی گرلز سیکنڈری اسکول کی صبرین مشتاق پہلے انعام کی مستحق

تقریری مقابلے کے سامعین جنہوں نے کئی گھنٹے تک انتہائی دلچسپی سے ساری تقریریں سنیں۔

محسنِ انسانیت

رپورٹ: منیر احمد راشد

گاڑی مین روڈ سے الٹی طرف ایک گلی میں مڑی اور ایک بڑے سے گیٹ کے سامنے رک گئی۔ گاڑی کی آواز سن کر عمارت کے چوکیدار نے گیٹ کی ذیلی کھڑکی سے جھانک کر دیکھا اور ہمارے چہروں پر نظر پڑتے ہی فوراً دروازہ کھول دیا۔ ہم گاڑی سے اترے اور اپنے بڑے بڑے سیاہ بیگ اٹھائے گیٹ سے گزر کر سامنے بر آمدے کی طرف بڑھے جہاں گارڈز مستعد کھڑے ہوئے ہمیں دیکھ رہے تھے۔ تین سیڑھیاں چڑھ کر ہم بر آمدے میں داخل ہوئے۔ سامنے ہی ہال کا مین گیٹ تھا۔ بر آمدے میں دائیں بائیں خوب صورت پودوں کے گملے قطار اندر قطار رکھے تھے۔ ہال کے بائیں دروازے کے قریب استقبالیہ تھا اور دائیں دروازے پر ایک نونہال کیڈٹ کاقد آدم پورٹریٹ ہاتھوں میں گلدستہ لئے سراپا استقبال بنا ہوا تھا۔ ہم نے ایک نظر اُدھر دیکھا، پھر سیدھے صدر دروازے سے ہال میں داخل ہوئے اور اس سرخ قالین پر قدم رکھا جو دروازے سے لے کر ہال کے دوسرے سرے پر موجود اسٹیج تک ہمارے لئے فرش راہ بنا ہوا تھا۔ ہم خراماں خراماں چلتے ہوئے اسٹیج تک پہنچے۔

اپنے اپنے بیگ کھولے اور ان میں سے انعامی شیلڈز اور کتابیں نکال کر اسٹیج پر موجود بڑی سی میز پر سجا دیں۔ یہ انعامات آج کے تقریری مقابلے کے فاتحین کو دیئے جانے تھے۔

جس دن کا ہم ذکر کر رہے ہیں وہ ماہ اکتوبر کا ۲۹ واں دن تھا اور جس ہال میں ہم کھڑے تھے یہ شہید ملت روڈ پر واقع ڈی ایم ایس انگلش بوائز سیکنڈری اسکول کا ہال تھا اور تقریب ماہنامہ آنکھ مچولی کی سالانہ تقریب تھی جس کا عنوان "سیرت کانفرنس" رکھا گیا تھا۔ اس تقریب میں ایک بین المدارس تقریری مقابلے کا اہتمام کیا گیا تھا۔ جس کا موضوع تھا۔

حضور پاک ؐ بحیثیت محسنِ انسانیت
حضور پاک ؐ بحیثیت سربراہِ مملکت
حضور پاک ؐ بحیثیت سپہ سالارِ اعظم

اس تقریری مقابلے میں کراچی بھر سے تقریباً پچیس اسکولوں کے طلبہ اور طالبات نے حصہ لیا۔ دو بج کر بیس منٹ پر مہمان خصوصی کراچی یونیورسٹی کے شعبہ معارف اسلامی کے چیئرمین جناب ڈاکٹر اختر سعید صاحب تشریف لائے۔ مہمان کا استقبال ڈی ایم ایس، اسکول کے پرنسپل جناب اسرار احمد شمسی اور ماہنامہ آنکھ مچولی کے مدیر اعزازی جناب طاہر مسعود صاحب نے کیا۔ اس کے ساتھ ہی گیٹ پر مستعد کھڑے نونہال کیڈٹس نے انہیں سلامی پیش کی اور ان کی رہنمائی کرتے ہوئے انہیں پریڈ گراؤنڈ کی طرف لے گئے جہاں انہیں گارڈز

آصف غوث کا جوش و جذبہ قابلِ دید تھا

آف آنر پیش کیا گیا۔ یہاں سے فارغ ہونے کے بعد مہمان اس بڑے ہال میں تشریف لائے جہاں تقریب کا اہتمام کیا گیا تھا۔ ہال کو بڑی خوب صورتی سے سجایا گیا تھا۔ درمیانی دروازے پر دو مستعد کیڈٹ بالکل چوکس کھڑے تھے یہ ڈی ایم ایس اسکول کے طلبہ تھے جنہیں آج اس تقریب کے انتظام کے علاوہ میزبانی کے فرائض بھی انجام دینے تھے اور وہ بخوبی انہیں انجام دے بھی رہے تھے۔ بالکل اسمبلی ہال جیسا منظر لگ رہا تھا۔ ایک گارڈ کے پاس سے گزرتے ہوئے ہم نے محسوس کیا کہ اس کی پتلون کی جیبیں کچھ مخصوص انداز میں ابھری ہیں۔ حفاظت کے اس قدر اہتمام پر ہمیں حیرت ہوئی۔ ہم نے اپنا شک مٹانے کے لئے یوں ہی اس سے پوچھ لیا۔ "جیبوں میں کیا ہے جوان؟" بڑی راز داری سے جواب دیا گیا "اسلحہ۔" پھر فوراً ایک جیب میں ہاتھ ڈالا اور ایک موٹا سا کیلا نکال کر ہمیں دکھایا "یہ اسلحہ ہم بھوک کے خلاف استعمال کریں گے۔" کیڈٹ نے تیزی سے کہا اور فوراً کیلا واپس جیب میں رکھ لیا۔ یہ زین خان تھے۔ بڑے چاق و چوبند اور ہنس مکھ۔ پروگرام کے دوران ان سے ہماری اچھی خاصی دوستی ہو گئی۔

ہال کو کرسیوں کی ترتیب سے دو حصوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا۔ ایک طرف طالبات، ان کی ٹیچرز اور دیگر خواتین تشریف فرما تھیں۔ دوسری طرف طلبہ اور دیگر حضرات۔ اسٹیج کے پس منظر میں ماہنامہ آنکھ مچولی اور سیرت کانفرنس کے بینرز لگے ہوئے تھے۔ اس کے علاوہ بھی ہال میں چاروں طرف رنگ برنگے بینرز لگائے گئے تھے جن پر علم اور ادب کی فضیلت سے متعلق مختلف آیات اور احادیث درج تھیں۔

مقابلے کے منصفین محمود احمد فاروقی، محمد منظر امام، ایس ایم معین قریشی

ڈھائی بجے تقریب کا باقاعدہ آغاز ہوا۔ مہمان خصوصی کے علاوہ صدرِ مجلس ڈی ایم ایس اسکول کے پرنسپل جناب اسرار احمد شمسی نے اپنی نشستیں سنبھال لیں۔ کمپیئرنگ کے فرائض جناب طاہر مسعود صاحب انجام دے رہے تھے۔ سب سے پہلے ڈی ایم ایس اسکول کے طالب علم حافظ اویس نے تلاوت کلام پاک کی، پھر اسی اسکول کے غلام علی نے اپنی خوب صورت آواز میں ہدیہ نعت بحضور سرور کائنات پیش کیا۔

تقریب کی نوعیت کے بارے میں بتاتے ہوئے مدیر اعزازی ماہنامہ آنکھ مچولی کراچی نے کہا کہ اس کا انعقاد بھی اس بڑے مقصد کے حصول کا ایک حصہ ہے جس کے لئے ماہنامہ آنکھ مچولی شروع کیا گیا۔ یعنی بچوں کی ذہنی، روحانی اور جذباتی نشوونما۔

رسالہ آنکھ مچولی کی خدمات کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ اس پرچے نے بچوں کو ہر طرح کی عصبیت سے بلند کرنے کی کوشش کی ہے۔ سماجی خدمات میں سگریٹ نوشی کے خلاف ایک ملک گیر تحریک چلائی جس کے نتیجے میں پی آئی اے نے اپنی اندرون ملک پروازوں کے دوران سگریٹ نوشی پر پابندی عائد کر دی۔ ماحولیات کو آلودگی سے پاک رکھنے کے لئے تحریک چلائی مختلف کتابوں کا اجرا کیا۔ موضوعاتی نمبرز (خوفناک نمبر، حیرت ناک نمبر، قہقہہ نمبر، عالمی ادب نمبر، دل دل پاکستان نمبر، اطفال نمبر وغیرہ) نکال کر بچوں کو بہترین ادب فراہم کرنے کے علاوہ دیگر رسالوں کے لئے نئی راہیں کھولیں۔ پرنٹ میڈیا سے آگے بڑھ کر الیکٹرانک میڈیا پر بچوں کے لئے کام کیا اور آنکھ مچولی ویڈیو میگزین جیسی ایک کامیاب کوشش پیش کی۔

مقابلے کے قواعد و ضوابط بتاتے ہوئے انہوں

نے کہا کہ آج تین انعامات دیئے جائیں گے۔ اوّل، دوئم اور سوئم۔ اس کے علاوہ زیادہ نمبر حاصل کرنے والے اسکول کو ٹرافی دی جائے گی جو گردشی نہیں ہوگی بلکہ جو اسکول ایک بار ٹرافی جیت لے گا، وہی اس کا مالک ہو گا۔ کچھ خصوصی انعامات بھی دیئے جائیں گے۔ ہر مقرر کو صرف تین منٹ دیئے جائیں گے۔ زیادہ وقت تقریر کرنے والے مقرر کے نمبر کاٹ لئے جائیں گے۔ منصفین کا فیصلہ آخری اور حتمی ہو گا۔ منصفین کے فرائض انجام دینے کے لئے ڈی ایم ایس اسکول کے استاد جناب محمد منظر امام صاحب اور سابق افسر تعلقاتِ عامہ جامعہ کراچی جناب محمود احمد فاروقی صاحب کا نام پکارا گیا۔ چیف جج ایس ایم معین قریشی صاحب ڈائریکٹر سندھ ایمپلائز سوشل سکیورٹی اسکیم ذرا تاخیر سے تشریف لائے۔ ماہنامہ آنکھ مچولی کے مدیر اعلیٰ جناب ظفر محمود شیخ صاحب بھی بہ نفسِ نفیس اس پروگرام میں شریک ہوئے۔ پروگرام کے اختتام سے کچھ دیر پہلے آنکھ مچولی کے سابق مدیر اعزازی جناب سلیم مغل صاحب بھی تشریف لے آئے۔

تقریری مقابلہ شروع ہوا تو ایک سماں بندھ گیا۔ تمام طلبہ اور طالبات خوب تیاری کر کے آئے تھے اور بڑے اعتماد اور روانی سے بول رہے تھے۔ کچھ ایسے بھی تھے جنہوں نے دیکھ کر تقریریں کیں مگر ان کی تعداد کم ہی تھی۔ بعض مقرر تو اتنے چھوٹے سے تھے کہ روسٹرم کے پیچھے غائب ہو گئے بالآخر ان کے لئے مائیک کو الگ ہٹا کر رکھنا پڑا۔ یہاں خصوصاً گلستان شاہ لطیف بوائز سیکنڈری اسکول کے آصف غوث کا ذکر ضروری ہے جو شاید سب سے چھوٹے لیکن سب سے زیادہ پر اعتماد مقرر ثابت ہوئے۔

بعض مقررین نے معروف دینی عالموں کے انداز میں تقریریں کیں اور سامعین نے نقل میں اصل کا مزا پایا۔ انگلش اور عربی میں بھی تقریریں کی گئیں۔

پروگرام مغرب تک چلتا رہا اور کہیں بھی بوریت کا شکار نہیں ہوا۔ آخر میں مہمانِ خصوصی نے اختتامی خطبہ دیتے ہوئے فرمایا کہ اللہ کا پیغام ایک ہی تھا جسے مختلف ادوار اور مقامات پر انبیا لے کر آئے۔ انہوں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ کو اپنے پیغام کے نئے ایڈیشن بھیجنے کا شوق نہیں تھا بلکہ یہ انسانی شعور کی قوتِ برداشت پر منحصر تھا کہ وہ کس قدر پیغام کو سمجھ سکتا ہے۔ اسی لئے جب انسانیت شعور کے اس مقام پر پہنچ گئی کہ پیغامِ خدا کو سمجھ سکے اور محفوظ رکھ سکے تو نبی آخرالزمان تشریف لائے۔ انہوں نے مقررین کی خوب حوصلہ افزائی کی اور انہیں شاباش دی۔ انہوں نے نصیحت کی کہ یہ محض عقیدت کے اظہار کا دور نہیں ہے بلکہ قرآن تو انسان کو اندھے اعتقاد سے ہٹا کر عقلی اعتقاد پر مائل کرتا ہے۔ ان کے بعد چیف جج معین قریشی صاحب نے انعام یافتگان کا اعلان کیا۔ جس کے مطابق پہلا انعام عائشہ باوانی گرلز سیکنڈری اسکول کی امبر

تقریر کے دوران ضروری نکات پر نظر ڈال لینے میں کوئی حرج بھی نہیں

مشتاق نے دوسرا آغا خان اسکول کھارادر کے طلعت اقبال نے اور تیسرا انعام ڈی ایم ایس انگلش گرلز اسکول شہید ملت روڈ کی طلعت فاطمہ نے حاصل کیا۔ انعامات میں شیلڈز اور کتابوں کے علاوہ اوّل اور دوم آنے والے مقررین کیلئے ایک ایک سال تک اور سوئم آنے والے مقرر کے لئے چھ ماہ تک اعزازی طور پر ماہنامہ آنکھ مچولی کا اجرا بھی شامل تھا۔ ایک خصوصی انعام آر آئی۔ جی اسکول فیڈرل بی ایریا کی فوزیہ فرح کو دیا گیا، انہوں نے انگلش میں تقریر کی تھی۔ دوسرا خصوصی انعام ڈی ایم ایس انگلش گرلز اسکول شہید ملت روڈ کی صدف پٹیل نے حاصل کیا۔ خصوصی انعام حاصل کرنے والوں کو کتب، شیلڈ کے علاوہ تین ماہ تک آنکھ مچولی اعزازی طور پر دیا جائے گا۔ یوں مجموعی طور پر زیادہ نمبر حاصل کرنے پر خصوصی ٹرافی "نشان احمد" ڈی ایم ایس انگلش گرلز اسکول شہید ملت روڈ کے حصہ میں آئی۔

تقسیم انعامات کے بعد شرکائے محفل میں احمد فوڈ انڈسٹریز کے خوب صورت پرنٹڈ پولی تھین بیگ میں گفٹ پیک تقسیم کئے گئے جن میں کتابوں کے علاوہ مٹھائی اور نمکو کے پیکٹ بھی تھے بیگ حاصل کرنے کے بعد ہم سوچ رہے تھے کے اگر آنکھ مچولی کی یہ سالانہ تقریب ہر ماہ ہوا کرے تو کتنا مزہ آئے۔

سیرت کانفرنس کی ویڈیو فلم دستیاب ہے۔ دلچسپی رکھنے والے حضرات دفتر ماہنامہ آنکھ مچولی سے رجوع کریں

قائدِ اعظم

ایسا کہاں سے لائیں کہ تجھ سا کہیں جسے

دنیا میں بہت سے لیڈر اور مدبّرین گزرے ہیں مگر حضرت قائدِ اعظم رحمتہ اللہ علیہ اپنی دیانت داری، بلند کردار اور قومی ہمدردی کی خوبیوں کی وجہ سے انتہائی ممتاز ہیں۔ انھوں نے زندگی میں جو کمایا وہ اپنے آپ پر بھی خرچ کیا اور اپنے لواحقین، رشتہ داروں اور ذاتی اسٹاف پر بھی خرچ کیا لیکن اس سارے عمل میں فضول خرچی کو جگہ حاصل نہ تھی۔ ایک ہندو "شوالال" نے اپنی کتاب "ہندوستان کے نادان حکمران" میں لکھا کہ گاندھی نے جنوری ۱۹۱۵ء سے تادمِ وفات اپنی قوم کا کھایا۔ حتیٰ کہ ان کی بکریاں بھی قوم کے پیسوں پر پلیں۔ نہرو ۱۹۲۰ سے کانگریس میں شامل ہوئے وہ تنخواہ لیتے اور ہر سال تنخواہ اور مراعات میں اضافے پر اصرار کیا کرتے تھے۔ انھوں نے کتابوں کی رائلٹی کو جو کئی لاکھ سالانہ تھی اپنی بیٹی اندرا گاندھی کے نام کر دیا تھا۔ مصنف سابق بھارتی صدر "راجندر پرشاد" وزیر "سردار پیٹل" اور سابق وزیرِ اعظم اندرا گاندھی کی شاہ خرچیوں اور مالی بدعنوانیوں کا ذکر کرنے کے بعد جب قائدِ اعظمؒ کا ذکر کرتا ہے تو بے ساختہ لکھتا ہے "مسٹر جناح نے تمام عمر اپنی محنت و مشقت سے خوب پیسہ کمایا اور اس دولت کو قوم پر بھی خرچ کیا۔ بہنوں کو بھی ان کا حصہ دیا۔ جواب میں اپنی قوم سے کچھ بھی نہ لیا۔ بلکہ وفات کے بعد بہت سے پاکستانی اور ہندوستانی تعلیمی اداروں (علی گڑھ وغیرہ) کے لئے بیشمار رقم وقف کر گئے۔ بھارت کے مشہور انگریزی روزنامہ

(Statesman) نے ۲ اکتوبر ۱۹۴۸ء کو قائدِ اعظم ؒ کی وصیت شائع کی۔ جو اس طرح ہے۔ "مسٹر جناح نے اپنے ذاتی اکاؤنٹ میں ۴۰ لاکھ روپے چھوڑے۔ پبلک فنڈ میں انھوں نے ۸۴ لاکھ روپے چھوڑے (جو مسلم لیگ اور چند دیگر اداروں کو منتقل ہو گئے) ذاتی فنڈ سے بمبئی یونیورسٹی کو (جہاں قائد اعظم ؒ نے کچھ عرصہ تعلیم حاصل کی) پچاس ہزار روپے، انجمن اسلام بمبئی اور اینگلو عربیک کالج دہلی کو ۲۵، ۲۵ ہزار روپے دیئے۔ اپنے خاندان کے افراد کو حصہ دینے کے بعد باقی بیس لاکھ روپے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، اسلامیہ کالج پشاور اور سندھ مدرستہ الاسلام کراچی کے درمیان برابر تقسیم کرا دیئے۔

ایک وکیل کی حیثیت سے آپ کو ایک منفرد اور بلند مقام حاصل تھا۔ بمبئی کے ایک کامیاب اور قابل وکیل نے آپ کی صلاحیتوں کا اعتراف ان الفاظ میں کیا۔ "مجھے نہیں معلوم وہ (جناح) یہ سب کیسے کر لیتے ہیں۔ یہ دیانت داری اور بلند کرداری ان (جناح) ہی کا شیوہ ہے۔"

قائدِ اعظم ؒ محض دولت کی بنا پر مقدمے نہیں لیا کرتے تھے۔ ایک دفعہ ایک مہاراجہ نے آپ کو اپنا ایک غلط اور جھوٹا کیس لڑنے کو کہا مگر آپ نے انکار کر دیا اور جواب دیا۔ "میں وکیل ہوں دلال نہیں۔"

آپ اپنی جرأت اور بے باکی کی وجہ سے بہت مشہور تھے۔

اس سلسلے میں قائدِ اعظم ؒ انگریز ججوں کو بھی خاطر میں نہ لاتے تھے۔ ایک دفعہ ایک مقدمے میں انگریز جج قائدِ اعظم کے تیز و تند دلائل سے بھنّا گیا اور بولا "مسٹر جناح میں آپ کی باتوں کو ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے نکال دیتا ہوں۔" قائدِ اعظم ؒ نے برجستہ جواب دیا۔ "جناب غالباً آپ کے کانوں کے درمیان والی جگہ خالی ہے۔" قائدِ اعظم ؒ کی قیادت ہمارے لئے مثالی ہے۔ ۱۹۴۶ء کا ذکر ہے مسلم لیگ کے فنڈز کے لئے ملک بھر سے مسلمان چندے کے لئے چھوٹی بڑی رقمیں بھیج رہے تھے۔ ان میں دس ہزار سے لے کر ایک روپے تک کی رقوم ہوتی تھیں۔ قائدِ اعظم ؒ ہر رقم کی رسید لکھتے تھے اس طرح خاصا وقت صرف ہوتا تھا۔ ایک دن سیکرٹری نے آپ سے کہا کہ جناب آپ صرف بڑی بڑی رسیدوں پر دستخط کیا کریں۔ اس طرح چھوٹی موٹی رسیدوں پر دستخط کرنے سے آپ کا جو وقت ضائع ہوتا ہے۔ وہ بچ جائے گا۔ قائدِ اعظم نے فرمایا "ہرگز نہیں۔ مجھے ان رسیدوں پر خود دستخط کرنے چاہئیں۔ اس غریب مسلمان کے لئے جو مجھے ایک روپیہ بھی بھیجتا ہے، یہ رقم ایسی ہی ہوگی جیسے دس ہزار یا بیس ہزار۔ اس غریب مسلمان کو یہ معلوم ہونا چاہئے کہ میں اس کی مدد کی قدر کرتا ہوں اور اس کے عطیے کو قیمتی سمجھتا ہوں۔" یہ تھے ہمارے قائدِ اعظم ؒ جن کی مثال حالیہ سیاسی تاریخ میں کسی دوسرے رہنما سے نہیں دی جا سکتی۔

غبارے والا

امان اللہ نیر شوکت

پھولوں جیسا پیارا بچّہ
اک تقدیر کا مارا بچّہ
کپڑے پہنے پھٹے پرانے
گھر سے نکلا لے کے غبارے
ہر کوچے میں جا کے پکارے
آٹھ آٹھ آنے لے لو غبارے
دن بھر گھومے بھوکا پیاسا
یہ بچہ معصوم ذرا سا
تاکہ پیسے کچھ بچ جائیں
گھر والوں کے کام جو آئیں
جب رستوں پہ چلتا ہوگا
اپنے دل میں سوچتا ہوگا
کب بدلے گی میری حالت
کب جائے گی میری غربت
کب پہنوں گا کپڑے اچھّے
کب کھاؤں گا کھانے اچھّے

شکر اور شکریہ

پروفیسر عنایت علی خان

چچا..... "عبداللہ! اے میاں عبداللہ، دیکھو یہ ہم تمہارے لئے کیا لائے ہیں؟"

عبداللہ..... (دور سے) "جی چچا جان، ابھی آیا۔"

چچا..... "یہ لو بھئی یہ تمہارا انعام، اس روز ہم نے تم سے کہا تھا نا کہ تمہیں ایک اچھی سی کتاب انعام میں دیں گے تو وہ یہ کتاب ہے۔ لو!"

عبداللہ..... (پڑھتا ہے) "ہمارے پیارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم..... شکریہ چچا جان!"

چچا..... "پسند آئی تمہیں؟ خاصی تلاش کے بعد یہ اچھی کتاب ملی ہے ورنہ الّم غلّم قسم کی کہانیوں کی کتابیں تو بہت سی تھیں۔"

عبداللہ..... "وہ جنوں بھوتوں کی کہانیاں تو ہمیں پسند بھی نہیں ہیں۔ یہ تو بہت اچھی کتاب ہے۔ آپ کا بہت بہت شکریہ۔"

چچا..... "تمہارے بار بار شکریہ کہنے پر ہمیں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی بات یاد آرہی ہے۔"

عبداللہ..... "کون سی بات چچا جان؟ ہمیں بھی بتلایئے!"

چچا..... "ایک مرتبہ آپ نے ایک بے سہارا بدّو کی مدد کی تو اس نے آپ کا شکریہ ادا کیا۔ آپ نے اس سے فرمایا کہ شکریئے کی کوئی بات نہیں، حاکمِ وقت کا فرض ہے کہ اپنی رعایا کی خبر گیری کرے، اپنا فرض ادا کرنا کوئی ایسی بات نہیں، جس پر شکریہ ادا کیا جائے۔ ہاں! مجھے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا چاہئے جس نے مجھے تمہاری خدمت کی توفیق عطا فرمائی۔"

عبداللہ..... "ویسے چچا جان شکریہ تو ادا کرنا چاہئے نا، جب کوئی ہمیں کوئی چیز دے؟"

چچا..... "ہاں ہاں ضرور ادا کرنا چاہئے، لیکن تم سمجھے ہم نے تمہیں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا واقعہ کیوں سنایا ہے؟"

عبداللہ..... "پتا نہیں، شکریہ ادا کرنے پر سنایا ہے آپ نے۔"

چچا..... "یہ واقعہ سنانے سے ہمارا مطلب یہ تھا کہ کوئی شخص ہمارے ساتھ کوئی بھلائی کرے تو اس کا شکریہ تو ضرور ادا کرنا چاہئے لیکن ذہن میں یہ بات ضرور رہنی چاہئے کہ بھلائی کی توفیق کیوں کہ اللہ تعالیٰ دیتا ہے اس لئے انسان کا شکریہ ادا کرنے کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ کا شکر ضرور ادا کرنا چاہئے اور الحمدللہ کہنا چاہئے۔"

عبداللہ..... "چچا جان ایک بات بتلایئے..... الحمد کے معنیٰ تو مولوی صاحب نے بتلائے تھے سب تعریفیں اللہ کے لئے ہیں۔"

چچا..... "ہاں وہ ترجمہ بھی صحیح ہے لیکن حمد کے معنیٰ تعریف کے ساتھ ساتھ شکر کے بھی ہیں اور اس کے یہ معنیٰ بھی ہیں کہ تمام تعریفوں کا اور شکر کا مستحق بس اللہ تعالیٰ ہی ہے۔"

عبداللہ..... "سب تعریفوں کا کیا مطلب ہے؟"

چچا..... "سب تعریفوں کا مطلب یہ ہے کہ ہم دنیا میں کسی چیز کی بھی تعریف کریں تو اصل میں تو وہ اللہ تعالیٰ ہی کی تعریف ہے جس نے اس چیز کو تعریف کے قابل بنایا ہے۔"

عبداللہ..... "ہاں چچا جان ہمیں حمد کے شعر یاد ہیں، سنائیں؟"

چچا..... "سناؤ!"

عبداللہ (ترنّم کے انداز سے پڑھتا ہے)

سورج چاند بنائے کس نے؟ اللہ نے
باغ میں پھول کھلائے کس نے؟ اللہ نے

اللہ نے اللہ نے ہمارے اللہ نے
اللہ نے ہاں، پیارے پیارے اللہ نے

چچا..... "ہم چاہے سورج چاند ستاروں کی تعریف کریں یا پھولوں اور پھلوں کی یا کسی انسان کی خوبیوں کی اصل میں تو ساری چیزوں اور انسانوں کو اللہ تعالیٰ ہی نے بنایا ہے نا، تو اصل تعریف تو بنانے والے کی ہوتی ہے۔ یہی حال شکر کا ہے۔ انسانوں کے شکریئے کے ساتھ اصل میں شکر اس کا کرنا چاہئے جو بھلائی کرنے کی توفیق عطا کرتا ہے۔"

عبداللہ..... "چچا جان، توفیق کسے کہتے ہیں؟"

چچا..... "توفیق عطا کرنے کے معنیٰ ہیں، کسی شخص کو کوئی کام کرنے کے قابل بنانا۔ جب اللہ تعالیٰ نے ہمیں اس قابل بنایا کہ تمہیں انعام دے سکیں، اگر اس نے ہمیں پیسے نہ دیئے ہوتے اور ہمارے دل میں تمہاری محبت پیدا نہ کی ہوتی تو ہم یہ کتاب تمہیں کیسے دیتے۔ اسی بات کو ہم اس طرح کہتے ہیں کہ اس نے ہمیں توفیق عطا کی کہ تمہیں یہ کتاب دیں۔ اب تمہیں چاہئے کہ ہمارا شکریہ ادا کرنے کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ کا شکر بھی الحمدللہ کہہ کر ادا کرو کیونکہ کتاب دلوائی تو اس نے ہے۔"

عبداللہ..... "ہم کھانا ختم کر کے بھی الحمدللہ کہتے ہیں۔"

چچا..... "کھانا بھی ہمیں وہی دیتا ہے، وہی زمین سے اناج ترکاریاں اور پھل پیدا کرتا ہے۔ اسی کی دی ہوئی سمجھ اور قوت سے تمہارے ابو نوکری کر کے پیسہ کماتے ہیں۔ اسی کی دی ہوئی عقل سے کام لے کر تمہاری امی مزیدار کھانے تیار کرتی ہیں۔ سارے کام اسی کی دی ہوئی توفیق سے ہوتے ہیں، اسی لئے ہمیں کھانا کھا کر اس کا شکر ادا کرنا چاہئے کہ اس نے ہمیں کھلایا پلایا اور مسلمان بنایا۔ یہی بات تو ہم کھانا ختم کرنے پر کہتے ہیں کہ،

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ اَطْعَمَنَا وَسَقَانَا وَجَعَلَنَا مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ ○

عبداللہ..... "اور اسی نے ہمیں سکھلایا ہے کہ چھینک آنے پر بھی الحمدللہ کہنا چاہئے اور سننے والے کو "یَرْحَمُکُمُ اللہ" کہنا چاہئے۔"

چچا..... "بے شک ہمیں اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی ہر نعمت پر اس کا شکر ادا کرتے ہوئے الحمدللہ کہنا چاہئے۔ اس نے فرمایا ہے کہ اگر تم میرا شکر ادا کرو گے تو اپنی نعمتوں میں اضافہ کرتا چلا جاؤں گا۔"

عبداللہ..... "تو چچا جان آپ کا شکریہ اور اللہ تعالیٰ کا شکر کہ اس نے اتنی اچھی کتاب دلائی۔ الحمدللہ۔"

لقمہ پر کیا بیتی؟

حماد خالد فیاضی

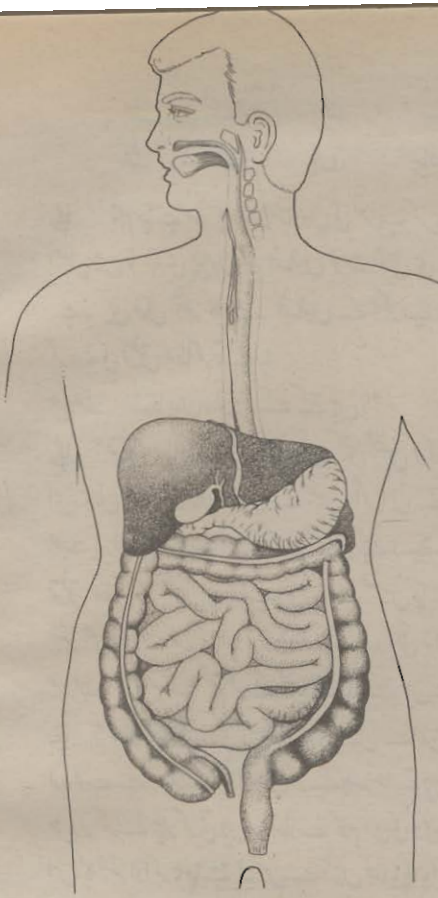

کبھی آپ نے سوچا ہے کہ یہ جو کھانے کے دوران آپ لقمے منہ میں ٹھونسے چلے جاتے ہیں تو ان بیچاروں پر کیا گزرتی ہے؟ اس کا کچھ علم ہے آپ کو؟ آیئے اس لقمہ کی تھوڑی سی حالتِ زار ہم آپ کو سناتے ہیں۔

آپ نے لقمہ منہ میں رکھا اور اسے دانتوں سے چبایا۔ آپ لقمے کو جتنا زیادہ چبائیں گے اتنا ہی فائدہ منہ ثابت ہو گا کیونکہ منہ سے معدہ تک جانے والی تنگ نالی (Esophagus) میں سے صرف چھوٹے ٹکڑے ہی گزر سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ چھوٹے چھوٹے ٹکڑے (Enzgmes) کو زیادہ رقبہ (Sarface area) مہیا کرتے ہیں اور یوں ہضم کا عمل تیز ہو جاتا ہے۔ منہ میں موجود (Salivary glands) ایک لعاب دار مادہ تیار کرتے ہیں جسے مشکل زبان میں لعابِ دہن اور آسان زبان میں تھوک (Saliva) کہا جاتا ہے۔ تھوک لقمہ میں حل ہو کر اسے نرم اور چکنا بنا دیتا ہے تاکہ اسے آسانی سے نگلا جا سکے۔ لیجئے بھئی منہ کا کام تو یہاں ختم ہوا۔ اب آگے کی سنئے۔

یہ لقمہ خوراک کی نالی (Esophagus) سے ہوتا ہوا معدہ میں پہنچ جاتا ہے۔ معدے کی دیوار بہت موٹی ہوتی ہے اور اس میں بہت سے غدود (Glands) شامل ہوتے ہیں جنہیں گیسٹرک گلینڈز (Gastric Glands) کہا جاتا ہے۔ یہ گیسٹرک گلینڈز، گیسٹرک جوس (Gastric Juice) پیدا کرتے ہیں۔ گیسٹرک جوس میں ایک (Enzgme Pepsin) (پیپسین) ہوتا ہے جو تیزاب (Hcl) کی موجودگی میں پروٹینز وغیرہ کو ہضم کرتا ہے۔ کیا کہا آپ نے؟ نہیں سمجھ میں آرہا ہے؟۔ اچھا تو اب آسان طریقے سے یوں

سمجھئے Gastric Glands نے Gastric Juice پیدا کیا Gastric Juice میں Pepsin موجود ہے Pepsin نے پروٹینز ہضم کیں۔ آپ کے لقمے میں جتنی زیادہ پروٹینز ہوں گی ان کو ہضم کرنے کیلئے اتنا ہی زیادہ گیسٹرک جوس پیدا ہو گا۔ مثلاً اگر آپ نے لقمے میں سب سے نظر بچا کر ایک گوشت کی بوٹی لی اور اسے منہ تک لے جانے میں کامیاب بھی ہو گئے تو آپ کے معدے میں زیادہ گیسٹرک جوس پیدا ہو گا کیونکہ گوشت میں پروٹینز زیادہ تعداد میں ہوتے ہیں۔ اسی دوران معدے کی مسلسل حرکت کی بدولت لقمے کے مزید چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ہو جاتے ہیں جن میں (Enzgmes) حل ہو کر ان کو ایک ملغوبہ کی شکل دے دیتے ہیں۔ اب آپ کا لقمہ معدے سے نکل کر چھوٹی آنت میں جانے کے لئے تیار ہے۔

چھوٹی آنت (Small Intesting) بہت ہی پیچ دار ہوتی ہے بالکل ایسے ہی جیسے مری جانے والی کوئی سڑک۔ چھوٹی آنت میں آپ کے مرحوم لقمے کا استقبال تین طرح کی Secretions کرتی ہیں۔

Pancreatic Juice یہ لبلبہ (Pancreas) میں پیدا ہوتا ہے اور ایک چھوٹی سی ٹیوب (Pancreatic duct) کے ذریعے چھوٹی آنت میں پہنچتا ہے۔

(Intestinal Juice) اس کو چھوٹی آنت کی اندرونی سطح پر موجود سیلز خارج کرتے ہیں (Bile) اس کو جگر (Liver) پیدا کرتا ہے اور یہ (Bile Duct) کے ذریعے چھوٹی آنت میں پہنچتا ہے۔

(Pancreatis Juice) اور (Intestinal Juice) میں (Enzymes) شامل ہوتے ہیں جو پروٹینز کو (Amino Acid) میں اور (Starch) (نشاستہ) کو (Sugar) میں تبدیل کر دیتے ہیں۔ (Bil) میں کوئی (Enzgme) نہیں ہوتا لیکن یہ چکنائی (Fast) کو تقسیم کر کے ان کو ہضم کرنے میں مدد دیتے ہیں۔

چھوٹی آنت کی اندرونی سطح پر لاکھوں کی تعداد میں چھوٹی چھوٹی انگلیوں کی طرح کی چیزیں موجود ہوتی ہیں جنہیں (Villi) کہتے ہیں۔ یہ ہضم شدہ خوراک کو جذب کرنے کا اہم کام سرانجام دیتی ہیں۔ چھوٹی آنت، بڑی آنت میں کھلتی ہے۔ بڑی آنت میں (Villi) نہیں ہوتے اور یہاں غیر ہضم شدہ خوراک میں سے پانی اور نمکیات کو جذب کر لیا جاتا ہے۔ باقی غیر ہضم شدہ خوراک جسم سے خارج ہو جاتی ہے۔

تو یہ تھی جناب ایک لقمے کی مکمل اور سادہ سی آپ بیتی۔ اب آپ جب بھی لقمہ منہ میں رکھیں تو ساتھ ساتھ سوچتے بھی جائیں کہ یہ کس حصہ میں جائے گا اور وہاں اس کے ساتھ کیا کچھ ہو گا؟ اس کا ایک فائدہ آپ کو یہ ہو گا کہ آہستہ آہستہ آپ کو عملِ انہضام (Digestive System) کے بارے میں سب کچھ ازبر ہو جائے گا اور اس کا ایک فائدہ آپ کی امی کو یہ ہو گا کہ آپ سوچنے میں لگے رہیں گے اور کلی کھانا بچ جائے گا گویا "فائدہ کا فائدہ اور بچت کی بچت!"

کھیر کس نے کھائی

بچوں کے مقبول مصنف اشتیاق احمد کی ایک دلچسپ، پُر اثر کہانی

کھیر کی ایک پلیٹ کم تھی۔ یہ دیکھتے ہی امی چلاّ اٹھیں:

"ہائیں! یہ کھیر کی ایک پلیٹ کہاں گئی، اس کو زمین کھا گئی، آسمان نگل گیا یا پھر ہوا میں اڑن چھو ہو گئی؟"

"بیگم خدا کے لئے!..... ایک جملے میں اتنے محاورے تو نہ بولا کرو..... تم اتنی مزے دار کھیر پکاتی ہی کیوں ہو....."

"اوہو..... عقل کے ناخن لیں، بات کو پہلے تولا کریں پھر بولا کریں..... میں نے کھیر کی نو پلیٹیں بھر کر رکھی تھیں، دسویں پلیٹ اسی وقت فاطمہ اور اس کی بیٹی شہناز کو دے دی تھی، انہیں گرم گرم اچھی لگتی ہے..... یوں بھی الماری میں دسویں پلیٹ آنہیں رہی تھی ..... ہم کُل نو ہیں .....

آخر نویں پلیٹ کہاں گئی؟ ..... اب میں نو آدمیوں میں آٹھ پلیٹیں کس طرح تقسیم کروں؟ یہ آپ بتا دیں! ..... مجھے تو کوئی اعتراض نہیں..... ویسے مجھے یہ بیل منڈھے چڑھتی

نظر نہیں آتی۔" امی نے روانی کے عالم میں کہا۔

"یہ تو واقعی سنگین معاملہ ہو گیا۔" میں نے حیرت زدہ انداز میں کہا۔

"کوئی سنگین و نگین نہیں ہوا..... مجھے بھوک محسوس ہو رہی تھی..... میں نے اپنے حصے کی کھیر کھالی تھی۔" ابا جان بولے۔

"لیجئے..... چڑھ گئی بیل منڈھے..... ارے مم..... مگر نہیں۔" میں بوکھلا اٹھا۔

"کیا مطلب کیا ہوا؟..... یہ بیل منڈھے چڑھتے چڑھتے رہ کیسے گئی؟"

"آپ کا بیان قابلِ قبول نہیں ہے ابا جان..... اس لئے کہ میں سمجھ گیا ہوں..... آپ صرف جھگڑے کو ختم کرنے کے لئے یہ بات کر رہے ہیں کہ کھیر آپ نے کھالی تھی۔"

"بالکل ٹھیک ہے..... کھیر تو میں نے کھائی تھی۔" باجی بولیں۔

"یہ بھی درست نہیں ہے..... کھیر میں نے کھائی تھی۔" میں نے کہا۔

"غلط..... بالکل غلط..... کھیر میں نے کھائی تھی۔"..... توحید بول اٹھا۔

"ہائیں ہائیں..... یہ کیا گُل کِھل رہا ہے!"..... امی جان نے مارے حیرت کے کہا۔

"توحید تم جھوٹ تو نہ بولو..... کھیر میں نے کھائی تھی۔" رفعت نے کہا

"نہیں..... میں نے کھائی تھی۔..... راحت فوراً بولا۔

"اب میں کیسے چپ رہ سکتا ہوں..... جب کہ کھائی صرف میں نے تھی۔" آصف نے کہا۔

"سفید جھوٹ! یہ کام میرا ہے۔" فاروق نے کہا۔

"اُف مالک..... کان نہ پک جائیں یہ سنتے سنتے..... اب پورے گھر میں صرف میں رہ گئی ہوں جس نے یہ نہیں کہا کہ کھیر میں نے کھائی تھی..... لیکن میں یہ بات کیسے کہہ دوں..... جب کہ میں نے کھائی ہی نہیں..... اور یہ بھی نہیں ہو سکتا کہ آپ آٹھوں نے ایک کھیر کی پلیٹ کھائی ہو..... کھائی تو کسی ایک نے..... اب فیصلہ کیسے ہو؟"

"فیصلہ کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے..... ہم سب ایک دوسرے کے لئے اپنی پلیٹ کی قربانی دینے کے لئے تیار ہیں۔ جس گھر میں یہ جذبہ موجود ہو..... وہاں مشکل حالات کے باوجود گزر بسر بہت آسانی سے ہوتی ہے..... لیکن ایک بات عجیب ہو گئی۔" ابا جان نے سنجیدہ انداز میں کہا۔

"اور وہ کیا؟" سب ایک ساتھ بولے۔

"ہم تو بالکل جھوٹ نہیں بولتے..... لیکن آج آٹھ افراد میں سے کم از کم سات نے تو جھوٹ بولا ہے..... کھیر تو کسی ایک نے کھائی..... کہا سب نے کہ میں نے کھائی..... کیا یہ بہتر نہیں ہو

اقوال زرّیں

۱..... جو طالب علم طلبِ علم کی حالت میں مرتا ہے شہید ہوتا ہے۔ (حدیث نبویؐ)

۲..... اپنے آپ کو تمنا سے بچا کیونکہ وہ بے وقوفوں کی وادی ہے۔ (حضرت محمدؐ)

۳..... ظالموں کو معاف کر دینا مظلوموں پر ظلم ہے۔ (حضرت عمر فاروقؓ)

۴..... تیرے سب سے بڑے دشمن تیرے بُرے ہم نشین ہیں۔ (حضرت غوث الاعظمؒ)

گا کہ جس نے کھائی ہے ..... صرف وہ سچ اُگل دے۔"

"صحن میں سناٹا چھا گیا..... سب کے سر جھک گئے..... سوائے امی جان کے، اس لئے کہ امی جان نے یہ الفاظ ادا نہیں کئے تھے۔

"مم..... میں..... اب..... سچ بولنے پر مجبور ہو گیا ہوں۔" میں نے ڈرے ڈرے انداز میں کہا۔

"تو وہ تم تھے .....چور کہیں کے ..... اٹھائی گیرے ....." امی جان نے تلملا کر کہا

"لیکن امی جان..... اگر میں نے کھیر کھائی ہے تو بھی آپ مجھے چور کس طرح کہہ سکتی ہیں ان پلیٹوں میں ایک تو میری تھی ہی۔"

"ہاں واقعی..... یہ تو ہے پھر تمہیں اس طرح چوری چھپے کھانے کی کیا ضرورت تھی؟"

"میں ..... اب سچ بولنے پر مجبور ہو چکا ہوں۔"

"آخر سچ کیا ہے؟..... یہ تم کب بتاؤ گے؟" باجی نے تلملا کر کہا۔

"امی جان کھیر ڈونگے میں نکال کر الماری میں نہیں رکھتیں ..... اس طرح ہر ایک کے حصے میں برابر کھیر نہیں آتی ..... لہٰذا جب بھی کھیر پکتی ہیں..... سب کی ایک ایک پلیٹ بھر دیتی ہیں..... اور ایک پلیٹ بھرتی ہیں..... شہناز اور اس کی والدہ فاطمہ کے لئے ..... اس لئے کہ آخر وہ بھی اس گھر کی پرانی ملازمہ ہیں..... آج بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ میں جو، ان کے کمرے کی طرف سے گزرا تو شہناز کھیر کھا رہی تھی اور ماں اسے ٹکر ٹکر دیکھ رہی تھی..... اس نے نصف پلیٹ بچا کر اپنی والدہ کی طرف بڑھائی..... فاطمہ نے وہ کھیر بھی بیٹی کو ہی کھلا دی..... کیونکہ وہ محسوس کر رہی تھی کہ ابھی شہناز کا جی اور کھانے کو چاہ رہا ہے..... بس مجھ سے رہا نہ گیا..... چپکے سے ایک پلیٹ نکال کر فاطمہ کو دے آیا..... یہ کہہ کر کہ یہ میرے حصے کی ہے اور آج میرا جی کھیر کھانے کو نہیں چاہ رہا..... اس نے کھیر لے لی..... وہ کھیر کھاتی رہی..... میں اسے کھاتے دیکھتا رہا..... اور سچ تو یہ ہے کہ..... کھانے میں شاید مجھے وہ مزا نہ آتا ..... جو ..... اس طرح آیا....."

سب لوگ میری طرف دیکھ رہے تھے..... خالی خالی نظروں سے ..... لیکن امی جان نہیں دیکھ رہی تھیں..... اس لئے کے اب صرف ان کا سر جھکا ہوا تھا۔

بچوں کیلئے انمول تحفہ

ڈرامے، گیت، مزاحیہ خاکے، خبریں، معلوماتی پروگرام اور بہت بہت کچھ

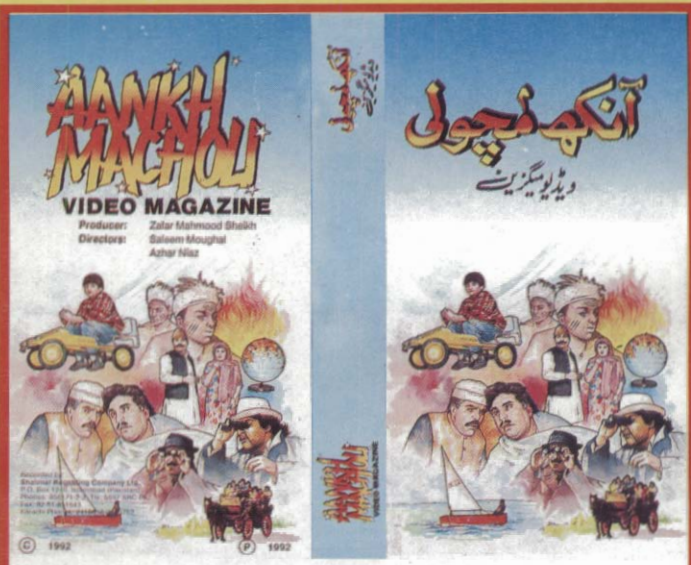

فن کار: ظل سبحان، نگہت بٹ، قاسم حبیبی، جمشید انصاری، لطیف منا، نجیب اللہ انجم، شاہد اسماعیل اور بہت سے دوسرے۔
موسیقی: ارشد محمود، پروڈیوسر: ظفر محمود شیخ، ہدایات: سلیم مغل، اظہر نیاز!

ویڈیو میگزین
آنکھ مچولی

آج ہی طلب فرمائیے

Aankh Macholi Video Magazine
1 - PIB Colony Karachi

قیمت: 150 روپے

جواب ۲۵ دسمبر تک ارسال کردیجیے

گن کے بتاؤ پاؤ انعام کتنے چہرے کتنے نام

در حیرت

سائنسی موضوعات پر سوال و جواب کا سلسلہ

س ...... کیا چاند پر جانے والے خلا باز وہاں پر درخت اُگانے کا تجربہ کر چکے ہیں۔

منیب احمد موریانی۔ سانگھڑ

ج ...... چاند پر جیسا کہ آپ کو معلوم ہے نہ ہوا ہے اور نہ پانی۔ یہ تو ایک بے آباد اور ویران سر زمین ہے جہاں زندگی اپنی کسی بھی شکل میں پائی نہیں جاتی۔ لہٰذا اس بات کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا کہ وہاں کی زمین پر ایسا کوئی تجربہ کیا جائے۔ ایسا غالباً صرف اسی صورت میں ممکن ہے کہ جب وہاں مصنوعی طور پر فضا بنائی جائے اور پانی وغیرہ کا انتظام کیا جائے۔

س ...... ہماری زمین کے کرۂ ہوائی کی بلندی کتنی ہے۔ کیا زمین سے بھیجے جانے والے مصنوعی سیارے کرہ ہوائی سے باہر زمین کے گرد چکر لگاتے ہیں؟

عبدالاحد قریشی۔ چترپڑی، میرپور آزاد کشمیر۔

ج ...... کرۂ ہوائی جسے ہم فضا بھی کہتے ہیں، بیس پچیس میل سے آگے نہیں۔ اور یہ فضا بھی بہت کام کی شے ہے۔ اگر یہ نہ ہوتی تو زمین پر زندگی کا نام و نشان تک نہ ہوتا۔ یہ چاند کی طرح ایک ویرانہ ہوتا جس پر ہر وقت شہابیوں کی گولا باری ہوتی رہتی۔ اور شہاب ثاقب کی اس یلغار سے

ین کا بھی وہی حشر ہوتا جو آج کل چاند کا ہے۔
ن اللہ تعالیٰ کو اس کرۂ ارض پر جاندار پیدا کرنے
تھے اس لئے زمین پر اس طرح کے حالات بہم
نچائے گئے جو زندگی کا عمل جاری و ساری رکھنے
ں معاون ثابت ہوں۔

آپ نے مصنوعی سیاروں کا پوچھا ہے تو بھائی
چیز کا حساب یہ ہے کہ وہ مستقل کشش ثقل کی
و میں ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اگر کسی جسم کو اوپر
نا میں اچھالا جائے اور اس کی رفتار کو پچیس ہزار
یل فی گھنٹہ کر دیا جائے تو وہ زمین کی کشش سے
زاد ہو کر خلا میں چلا جائے گا اور واپس نہیں
ئے گا لیکن اگر یہ رفتار اٹھارہ ہزار میل کے
یب ہو تو یہ جسم زمین کا قیدی بن کر اس کے گرد
ب مدار میں چکر لگانے لگے گا۔ مصنوعی سیاروں
... کو راکٹ پر رکھ کر خلا میں بھیجا جاتا ہے اور
ب راکٹ کی رفتار اٹھارہ ہزار میل فی گھنٹہ کے
یب پہنچ جاتی ہے تو یہ مصنوعی سیارے سے الگ
و جاتا ہے اور سیارہ زمین سے تقریباً سو ڈیڑھ سو
یل کے فاصلے پر ایک خاص مدار میں زمین کے
رد چکر لگاتا رہتا ہے۔ مصنوعی سیاروں کی بھی
ب زندگی ہوتی ہے۔ ہوتے ہوتے ان کا مدار بھی
ٹتا جاتا ہے اور یہ آخر کار فضا میں داخل ہو کر
حساب ثاقب کی طرح جل جاتے ہیں۔

ں ..... کچھ لوگوں کے بال کم عمری میں سفید ہو
جاتے ہیں۔ اس کا کیا سبب ہے۔؟

غزالہ عمران، لاہور

ج ..... بال دراصل ایک نلکی کی مانند ہوتا ہے۔ اس نلکی میں ایک رنگ دار مادہ بھرا ہوتا ہے جسے میلانن کہتے ہیں۔ بال سفید ہونے کا سبب یہ ہے کہ بعض حالات میں یہ مادہ ختم ہو جاتا ہے اور یوں بال سفید نظر آنے لگتے ہے۔ بالوں کے سفید ہونے کا براہِ راست تعلق عمر کے بڑھنے سے ہے۔ لیکن بعض حالات میں کم عمری ہی میں بال سفید ہو جاتے ہیں اور بعض وقت اچھی خاصی عمر والے لوگوں کے بال اپنا رنگ برقرار رکھتے ہیں۔ اچھی یا بری صحت اور مخصوص غذاؤں کے استعمال کا بظاہر بالوں کے سفید ہونے یا نہ ہونے سے کوئی تعلق نہیں۔ اس لئے اس بارے میں کوئی اصول نہیں بنایا جاسکتا۔

س ..... موم بتی جلتی ہے تو اس کا کچھ موم پگھل جاتا ہے لیکن اتنا نہیں ہوتا جتنا شروع میں موم بتی کا وزن تھا۔ سوال یہ ہے کہ موم کہاں غائب ہو جاتا ہے؟

نسیم انجم، چکوال۔

ج ..... موم کہیں غائب نہیں ہوتا بلکہ دوسرے اجزا میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ موم بتی روشن ہوتے ہی موم کی ٹھوس شکل مائع میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ مائع موم گیس کی شکل اختیار کر لیتا ہے جس کے جلنے سے ایک کیمیاوی عمل ہوتا ہے جس کی بدولت پیدا ہونے والی توانائی حرارت اور روشنی کی صورت میں ہمیں محسوس ہوتی ہے۔

موم دراصل ایک کیمیاوی مرکب ہے جس کے بنیادی اجزا کاربن اور ہائیڈروجن ہیں۔ موم

ہوا میں موجود آکسیجن کے ساتھ مل کر جلتا ہے۔ اس میں شامل کاربن، آکسیجن کے ساتھ مل کر کاربن مونو آکسائیڈ اور ہائیڈروجن اور آکسیجن کا ملاپ پانی بناتا ہے۔ لہٰذا موم بتی کا موم جلنے کے عمل سے گزرنے کے ساتھ دوسرے اجزا میں تبدیل ہوتا رہتا ہے اور بالآخر ختم ہو جاتا ہے۔

س ..... ہوا اور پانی آمیزے ہیں یا مرکب؟ تفصیل سے جواب دیجئے۔

سلمان احمد نواب، کراچی۔

ج ..... پہلے تو یوں سمجھئے کہ کائنات کی تمام چیزیں بنیادی طور پر مختلف عناصر سے مل کر بنی ہیں۔ یہ عناصر سو سے کچھ اوپر ہیں۔ عنصر کی تعریف یہ ہے کہ وہ مادہ کی ایسی سادہ ترین حالت ہے جسے دو یا اس سے زیادہ حالتوں میں تقسیم نہیں کیا جاسکتا اس بات کو اس طرح بھی کہا جا سکتا ہے کہ عنصر مادہ کی خالص ترین حالت ہے۔ لوہا، سونا، آکسیجن، پارہ، کاربن وغیرہ مختلف عناصر ہیں۔

دو یا اس سے زیادہ عناصر کو اس طرح سے ملایا جائے کہ ایک تیسری شکل بن جائے (جس کے اپنے الگ خواص ہوں) تو وہ ایک مرکب کو جنم دیتا ہے۔ مثلاً پانی ایک مرکب ہے جو ہائیڈروجن اور آکسیجن کے ملاپ سے پیدا ہوتا ہے۔ اسی طرح شکر بھی ایک مرکب ہے جس کے بنیادی اجزا یا عناصر آکسیجن، ہائیڈروجن اور کاربن ہیں۔ یاد رکھنے کی بات یہ ہے کہ مرکب ایک کیمیاوی تبدیلی کے نتیجے میں وجود میں آتا ہے اور اس کا بننا اور بن کر پھر سادہ حالت میں آجانا نسبتاً مشکل ہے۔ مرکبات قدرتی حالت میں بھی بنتے ہیں اور مصنوعی طور پر بھی بنائے جاتے ہیں۔

آمیزہ اس کے برخلاف نہایت سادہ سی شے ہے۔ ریت میں نمک کو ملا دیں، آمیزہ بن جائے گا ریت بدستور ریت رہی اور نمک کی خصوصیات اپنی جگہ برقرار رہیں اور ان دونوں کے اشتراک سے بننے والے آمیزے کی کوئی انفرادی خصوصیت بھی نہ ہوئی۔ آپ نے اندازہ کیا ہوگا کہ عمل نسبتاً آسان ہے اور اس میں کوئی کیمیاوی تبدیلی نہیں ہوتی۔ ہوا مختلف گیسوں کا ایک ایسا آمیزہ ہے جس کی بذات خود کوئی علیحدہ حیثیت نہیں بلکہ اس میں موجود گیسیں، ذرات اور آبی بخارات اپنی انفرادی شکل میں موجود ہیں۔

پہلا کام

دو دوست باتیں کر رہے تھے۔ ایک کہنے لگا۔

"اگر تمہارے پاس چھپر پھاڑ کر دولت آجائے تو سب سے پہلے تم کیا کرو گے؟"

دوسرا دوست ..... "بھائی کرنا کیا ہے، سب سے پہلے تو چھپر کی مرمت کراؤں گا۔"

مرسلہ ..... مسعود الرحمان، جہلم شہر

ہیں بہاریں جن کے دم سے

وسیم بن اشرف

بچوں کے اسکول کے قریب وہ باغ بہت خوبصورت تھا۔ جونہی انٹرول ہوتا، بچے باغ میں آجاتے اور جی بھر کر کھیلتے، چھٹی کے بعد وہ ایسا ہی کرتے تھے۔ وہ باغ ایک جن کا تھا۔ جو کہیں گیا ہوا تھا اور بچے اس کی غیر موجودگی سے خوب فائدہ

اٹھارہے تھے۔ کچھ عرصے بعد جب وہ جن واپس آیا تو اپنے روندے ہوئے باغ کو دیکھ کر بہت لال پیلا ہوا۔ اس نے باغ کے چاروں طرف اونچی اونچی دیواریں کھڑی کروادیں اور بیرونی دروازے پر ایک نوٹس بورڈ آویزاں کردیا جس پر لکھا ہوا تھا،

"بغیر اجازت باغ میں داخلہ ممنوع ہے۔ خلاف ورزی کرنے پر قانونی کارروائی کی جائے گی"۔ اگلے روز جونہی بچے باغ میں کھیلنے کے لئے آئے تو بیرونی دروازے پر آویزاں نوٹس بورڈ دیکھ کر ہکا بکا رہ گئے، حقیقت جان کر وہ بہت رنجیدہ ہوئے، وہ باغ جو ان کو بہت پیارا تھا، ان سے چھن گیا تھا۔ وہ آپس میں باغ کے متعلق

باتیں کرتے، اس کے سایہ دار پیڑوں کی تعریفیں کرتے، مگر اب وہ اس کے اندر داخل نہیں ہوسکتے تھے۔ جن بہت خوش تھا کہ باغ خراب کرنے والوں سے نجات ملی۔

خزاں گذرنے کے بعد بہار کا موسم آیا تو ہر طرف باغات میں پھل، پھول، بڑے خوشنما اور دلفریب انداز میں لہلہا رہے تھے۔ لیکن جن کے باغ پر وہی پت جھڑ کا دور دورہ تھا۔ جن بہت حیران تھا۔

"ہم کِھل کر کیا کریں گے"؟ ایک پھول دوسرے سے کہہ رہا تھا۔

"اور کیا! ہمیں کِھلے ہوئے دیکھ کر خوش ہونے والے "قدرت کے پھول" تو یہاں ہیں ہی نہیں"۔ دوسرے پھول نے اُداسی سے جواب دیا۔

اوپر درختوں پر گھونسلوں میں بیٹھی ہوئی چڑیاں سوچ رہی تھیں کہ "ہم کس کے لئے چہچہائیں، بچے تو یہاں ہیں ہی نہیں! جو ہماری رسیلی آواز سن کر اچھلیں کودیں۔"

موسمِ بہار کہہ رہا تھا "ناجی نا! میں تو اس باغ میں ہرگز نہیں جاؤں گا، میری بہار بچوں سے ہے، سارے جہاں کی بہاریں بچوں کے ہی دم سے ہیں، جب انہیں ہی اس باغ میں آنے کی اجازت نہیں تو میرا وہاں جانا بھی فضول ہے۔"

پھر ہوا یوں کہ کئی بہار کے موسم آئے اور گزر گئے، لیکن جن کے باغ میں بدستور خزاں ہی رہی، جن بڑا پریشان تھا کہ اس کے باغ میں بہار کیوں نہیں آتی۔

ایک روز اچانک سہ پہر کے وقت جن کی آنکھ کھل گئی، وہ سو رہا تھا، اس کے کانوں میں عجیب سے شوروغل کی آوازیں پہنچیں جو اس سے پہلے اس نے کبھی نہ سنی تھیں، اس نے محسوس کیا کہ اس کے کمرے میں کہیں سے بھینی بھینی خوشبو آرہی ہے۔ وہ پہلے تو حیران ہوا، پھر سوچنے لگا، پھر دفعتاً وہ خوشی سے اپنے پلنگ پر اچھلنے لگا۔

"میرے باغ میں بہار آگئی"! وہ دیوانگی سے چلانے لگا۔

فوراً اس نے کھڑکی سے باہر باغ میں جھانکا، باغ میں رنگ برنگے کپڑوں میں ملبوس بہت سے کمسن بچے اودھم مچا رہے تھے، کوئی پیڑ کی ڈالیاں پکڑ کر جھول رہا تھا، کوئی درخت کو جھولا بنائے بیٹھا تھا، چند بچے تتلیاں پکڑنے کی کوشش کر رہے تھے، درخت ہرے بھرے نظر آرہے تھے، پودے خوشنما پھولوں سے لدے ہوئے تھے، اور بچے بڑی بے تکلفی سے درختوں اور پودوں کے پھلوں کو چکھ رہے تھے۔ جب کوئی بچہ کسی پودے سے پھول توڑ لیتا تو اس کی معصوم شرارت پر کلیاں کِھل کر پھول بن جاتیں۔

دراصل ہوا کچھ یوں تھا کہ باغ کی دیوار کسی وجہ سے ایک طرف سے گر گئی تھی، اور تمام بچے موقع پاکر اندر گھس آئے تھے۔ ان کے آنے سے

مفت ہاتھ آئے تو.....

○ ..... ہوریس ڈی ویئر لندن کا ایک مشہور مسخرہ تھا۔ اسے لوگوں کو بے وقوف بنانے میں بہت مزہ آتا تھا۔ عقلمند سے عقلمند لوگ بھی اس کے ہاتھوں الو بن جاتے تھے۔ ایک دن ہوریس نے ایک فٹ پاتھ پر "دس پونڈ" کا ایک نوٹ گوند سے چپکا دیا، اور خود سامنے کی ایک دکان میں چھپ کر بیٹھ گیا۔ چند منٹ بعد ایک صاحب ادھر سے گزرے فٹ پاتھ پر نوٹ پڑا دیکھا تو ایک دم نیچے جھکے اور اسکو اٹھانے کی کوشش کی، لیکن اسے اٹھا نہ سکے اور کھسیانے ہو کر آگے بڑھ گئے۔

کچھ دیر بعد ایک خاتون آئیں۔ نوٹ دیکھ کر ان کے منہ میں بھی پانی بھر آیا لیکن انتہائی کوشش کے باوجود اسے اٹھا نہ سکیں۔ غرض اسی طرح دس بارہ لوگوں نے نوٹ اٹھانا چاہا لیکن ناکام رہے۔ ہوریس اور دکان میں موجود لوگ ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو گئے۔

(علی جبران ..... مخدوم پور بہوڑاں)

باغ میں بہار آگئی تھی، ہرے بھرے باغ میں بچوں کی بکھری ہوئی فوج، جن کو بڑی بھلی معلوم ہوئی۔ بچوں کے شور میں ایک خاص موسیقی سنائی دے رہی تھی۔ چنانچہ جن نے فیصلہ کر لیا کہ اب کبھی بھی وہ بچوں کو باغ میں آنے سے نہیں روکے گا۔ وہ باغ کے اندر گیا۔ بچے اس سے خوفزدہ ہو کر بھاگے، مگر اس نے بچوں کو واپس بلا کر ان میں پھل بانٹے، بچوں کے دل سے بھی جن کا ڈر نکل گیا۔ وہ جلد ہی اس سے گھل مل گئے۔

یکایک اس کی نظر باغ کے ایک کونے کے ایک درخت پر پڑی جو ابھی تک خزاں کے اثر سے آزاد نہیں ہوا تھا۔ وہ جونہی اس درخت کے پاس پہنچا تو دیکھا کہ ایک نہایت خوبصورت بچہ اس درخت پر چڑھنے کی کوشش میں مصروف ہے۔ درخت بار بار اپنی شاخیں جھکاتا تھا، لیکن وہ کم سن ہونے کے باعث انہیں پکڑ نہیں پاتا تھا، جن نے اسے پکڑ کر درخت پر بٹھا دیا۔ اس کے بیٹھتے ہی اک دم بہار آگئی، وہ درخت پھلوں سے بھر گیا۔ جن کی سمجھ میں اب آیا کہ اس باغ میں بہار انہیں بچوں کی وجہ سے آئی ہے۔ جن کو یہ بچہ خاص طور پر بہت پسند آیا۔ وہ اس کے ساتھ کافی دیر تک کھیلتا رہا، پھر اگلے روز سب بچے تو آئے مگر وہ بچہ نہیں آیا۔

پھر دھیرے دھیرے اس باغ میں بہت سی بہاریں آئیں اور رخصت ہو گئیں۔ سب سے پہلے جو بچے اس باغ میں کھیلنے کے لئے آئے تھے وہ جوان ہو گئے تھے۔ پھر ان کے بچے کھیلنے کے آئے لیکن جس بچے کی جن کو تلاش تھی وہ اس کے بعد کبھی نہ آیا۔ جن نے سب سے دریافت کیا۔ اس کا حلیہ بھی بتایا، لیکن سب نے لاعلمی کا اظہار کیا۔

جن بوڑھا ہو گیا اس بچے کی یاد اسے بہت ستاتی تھی وہ اکثر اس بچے کو یاد کر کے آنسو بہاتا۔ ایک دن عین موسم خزاں میں جن نے دیکھا کہ وہ درخت جس پر وہ بچہ اسے ملا تھا، پھولوں اور پھلوں

کام کی باتیں

○ ..... محبت کی ہستی وہ جیتی جاگتی تصویر ہے جس میں انسان کا ماضی، حال اور مستقبل جھانکتا ہے۔

○ ..... اگر تمہارے دوست تمہیں خامیوں سے آگاہ کریں تو تم خوش قسمت ہو کہ ایسا دوست رکھتے ہو۔

○ ..... وقت کے پاؤں میں آہٹ نہیں ہوتی، لہٰذا اس کے گزرنے کا احساس بھی نہیں ہوتا۔

○ ..... قسمت پہیے کی مانند گھومتی ہے۔ کوئی نیچے آتا ہے تو کوئی اوپر۔ جب تم اوپر جاؤ تو نیچے والوں کا ہاتھ تھام لو کیونکہ اگلے چکر میں تمہیں ان کی ضرورت پڑے گی۔

مرسلہ ..... پرنس فرحت۔ پاک بحریہ

سے لدا کھڑا ہے۔ وہ بھاگم بھاگ اس پیڑ کے پاس گیا۔ دیکھا تو وہ بچہ درخت پر بیٹھا ہوا ہے اور ہاتھ پھیلائے ہوئے اسے اپنے پاس بلا رہا ہے۔ اسے دیکھ کر جن کو تعجب ہوا، کہ اتنے سال گزرنے کے باوجود بھی اس بچے کی عمر میں کوئی فرق نہیں آیا۔

"اتنا عرصہ تم کہاں رہے؟ میں نے تمہارا بہت انتظار کیا۔"

"میرے مالک کا حکم نہ تھا کہ میں آج سے پہلے تمہارے پاس آؤں۔"

"میں اکثر اب تمہارے لئے بے چین رہتا ہوں، کیا تم میرے پاس نہیں رہ سکتے۔"

"مجھے جانے سے کون روک سکتا ہے، لیکن ہاں! میرے مالک نے اجازت دی ہے کہ میں تمہیں اپنے ساتھ لے آؤں، چلو گے؟"

"ہاں! جن جلدی سے بولا، ضرور چلوں گا تمہارا مالک بہت مہربان معلوم ہوتا ہے۔"

"ہاں۔" بچہ سنجیدگی سے بولا "وہ تم سے خوش ہے، تم نے اس کے بچوں کو اپنے باغ کی سیر کرنے دی ہے وہ تمہیں اپنے باغ کی سیر ضرور کرائے گا!"

"تمہارے مالک کا باغ کہاں ہے؟ مجھے اچھے باغ بہت پسند ہیں، کیا اس باغ کا کوئی نام بھی ہے؟" جن نے پوچھا۔

بچے نے جن کے گلے میں اپنی بانہیں حمائل کر دیں اور چپکے سے اس کے کان میں کہا "میرے مالک کا باغ کائنات کا سب سے بہترین باغ ہے۔ اس باغ کا نام "بہشت" ہے۔"

دوسرے روز جب بچے اسکول سے واپس آئے تو انہیں یہ دیکھ کر بڑا تعجب ہوا کہ جن کا باغ خزاں کے موسم میں بھی پوری طرح بہار پر ہے اور جونہی وہ اندر گئے تو قریباً سب بچوں کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے کہ ان کا محبوب جن زمین پر مرا پڑا ہے اور آس پاس کے پیڑوں نے اس پر پھولوں کی بوچھاڑ کر دی ہے۔

آسکر وائلڈ کی کہانی "معصوم پھول" سے ماخوذ

ایک تھے بھائی بھلکڑ

ننھے جاذب کی مزیدار رنگین باتصویر کہانی .... ہما طاہر

پیارے ساتھیو! بھولنے کی عادت اچھی نہیں ہوتی۔ اللہ تعالیٰ نے آدمی کو دیکھنے کیلئے آنکھیں دی ہیں۔ سُننے کیلئے کان دیئے ہیں۔ سونگھنے اور سانس لینے کیلئے ناک دی ہے۔ اسی طرح یاد رکھنے کے لئے حافظہ بھی دیا ہے۔ اور جس طرح آنکھیں رکھنے کے باوجود آدمی چلتے ہوئے کسی سے ٹکرا جائے تو ہنستے ہیں "کیا اندھے ہو گئے ہو۔ دیکھ کر نہیں چلتے" یا کوئی بات سُنی ان سُنی کر دی جائے تو کہا جاتا ہے کہ "کیا بہرے ہو۔ سنائی نہیں دیتا۔" بالکل اسی طرح آدمی کسی ضروری کام کو یاد نہ رکھے اور بھول جائے تو یہ بہت بری بات ہوتی ہے اور ایسے لوگوں کو "بھائی بھول بھلکڑ" کہا جاتا ہے۔ ہمیں چاہیے کہ اپنے ضروری کاموں کو یاد رکھیں۔ جن لوگوں کا حافظہ خراب ہوتا ہے وہ بھی ذرا سی کوشش کر لیں تو اپنا حافظہ ٹھیک کر سکتے ہیں۔ جیسے جاذب نے اپنے حافظہ کو بہتر بنایا۔ حافظہ اچھا نہ ہو تو امتحان پاس کرنا بھی مشکل ہو جاتا ہے۔ ہمیں امید ہے تم بھی اپنے حافظہ کو بہتر بناؤ گے اور اچھے بچے کہلاؤ گے۔ جاذب کی طرح ... کیوں ٹھیک ہے نا۔

ہمارا قائد

عبد القادر

ہم قائداعظم کے وفادار رہیں گے
ہم سیسہ پلائی ہوئی دیوار رہیں گے

قائد نے ہمیں درس اخوت کا دیا ہے
پیغام سدا مہر و محبت کا دیا ہے

غیروں کی غلامی کا جوا اس نے اتارا
گلزار وطن اپنے تدبر سے سنوارا

تنظیم و اتحاد و یقین جس کا ہے پیغام
ہر اہل وطن اس کا بنا بندۂ بے دام

قائد کے اصولوں سے جوں ہی آنکھ چرائی
دو نیم ہوا ملک، سزا قوم نے پائی

یہ نفرت و خوں ریزی، بموں کے یہ دھماکے
رشوت کا یہ ناسور، یہ ہڑتال، یہ ڈاکے

یہ ظلم و ستم اور یہ چیزوں میں ملاوٹ
یہ غربت و افلاس، یہ محلوں کی سجاوٹ

اشیائے نشہ اور یہ اغوا، یہ تعصب
احوال وطن دیکھ کے ہوتا ہے تعجب

کیوں شر کی فضا پیدا ہوئی اپنے وطن میں
قائد کو رلاتی ہے یہی بات کفن میں

یہ پاک وطن ہے مرے قائد کی امانت
ہو گی نہ کسی حال میں اب اس میں خیانت

اسلام کا پیغام ہی آئین وطن ہے
قائد کی ہدایات سے تزئین چمن ہے

کمپیوٹر

انسان کا عظیم خدمت گار

مشاہد شیخ

یہ بات تو آپ جانتے ہیں کہ سائنس و ٹیکنالوجی کے موجودہ دور میں جس شعبہ میں سب سے زیادہ تحقیق و ترقی و جستجو ہو رہی ہے وہ کمپیوٹر ہے۔

کمپیوٹر کو اردو میں حاسب کہتے ہیں۔حاسب (کمپیوٹر) الیکٹرانک سرکٹ پر مشتمل ایک ایسی مشین ہے جو اپنے اندر یاداشت کا ایک بہت بڑا ذخیرہ سموئے ہوئے ہے۔ اس میں ہدایات و معلومات اور منطقی باتوں کو سمجھنے اور ان پر عمل کرنے کی صلاحیت بھی ہوتی ہے۔کمپیوٹر کی یہ صلاحیت (ROM. Read Only Memory) کہلاتی ہے، دوسری صلاحیت (RAM.Random Acess Memory) کہلاتی ہے۔"روم" کمپیوٹر میں ہمہ وقت رہتی ہے۔ جبکہ "ریم" ایک عارضی علامت ہے۔ یعنی جب تک کمپیوٹر پر کام ہو رہا ہوتا ہے تو یہ برقرار رہتی ہے اور جب کمپیوٹر بند کرتے ہیں یا اچانک بجلی چلی جانے کے باعث یہ ایکدم ختم ہو جاتی ہے۔

اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ کچھ بھی کام آپ نے اب تک کمپیوٹر پر کیا ہے وہ ختم ہو گیا ہے۔ لہٰذا اس زحمت سے بچنے کے لئے یہ کیا جاتا ہے کہ

کمپیوٹر میں لگی ڈسک پر وقفہ وقفہ سے معلومات (Save)یعنی محفوظ کرتے رہتے ہیں۔

کمپیوٹر میں منطقی باتوں کو سمجھنے اور ان پر عمل کرنے کا کام (C.P.U)یعنی (Central Proces-sing Unit)انجام دیتا ہے۔

اور سی۔ پی۔ یو میں آلو (ALU) منطقی اور حسابی گتھیوں کو سلجھانے میں مدد دیتا ہے۔ گویا انسان کے بعد اگر کوئی سوچ سمجھ کر برق رفتاری کے ساتھ منطقی فیصلہ کرسکتا ہے تو وہ کمپیوٹر ہے۔ کمپیوٹر کے سلسلے میں ایک بات ذہن نشین رکھنی چاہئے کہ خود کچھ نہیں کر سکتا بلکہ آپ کی ہدایات کے مطابق سوچتا اور عمل کرتا ہے اگر آپ اسے صحیح ہدایات دیں گے تو یہ درست طریقے سے کام کرے گا اور غلط ہدایات دیں گے تو غلط کام کرے گا اور تمام کام کو تہہ وبالا کر کے رکھ دے گا۔ کمپیوٹر کو ہدایات دینے کے عمل کو پروگرامنگ کہتے ہیں اور اس کے لئے پروگرام لکھے جاتے ہیں۔ کمپیوٹر کے پروگرام (DATA)اور دیگر معلومات کو ہم جس بیرونی چیز پر محفوظ کرتے ہیں اس کو کیسٹ یا ڈسکٹ کہتے ہیں۔ کمپیوٹر میں اس مقصد کے لئے ایک ڈسکٹ ڈرائیو لگا ہوتا ہے۔ جس میں (Floppy Disk)فلاپی ڈسکٹ لگا کر پروگرام محفوظ کئے جاتے ہیں۔ کمپیوٹر پر ہم جو بھی کام کرتے ہیں اس کی (Output)بھی لیتے ہیں۔ جس کو ہارڈ کاپی کہتے ہیں اور یہ ہارڈ کاپی پرنٹر سے حاصل ہوتی ہے۔

کمپیوٹر کے تمام نظام اور اس کے دیگر طبعی حصوں اور آلات کو مربوط کرنے کے لئے بھی کچھ احکام اور ہدایات ہوتے ہیں جس کو ہم کمپیوٹر کا (O-perting System)کہتے ہیں۔ جب آپ یہ یقین کر لیں کہ کمپیوٹر کے چار اہم حصے یعنی مونیٹر (Moniter)پروسیسر (Proceessor)کی "ہیڈیا کی بورڈ" (Key Boord)اور "پرنٹر" (Printer)صحیح طریقے سے جوڑ دئے گئے ہیں تو کمپیوٹر سے نکلنے والے پلگ کو بجلی کا ساکٹ لگا کر آن کر دیں۔ اس کے بعد مونیٹر یا ٹیلی ویژن کا بٹن دبا دیں۔ پھر پروسیسر میں لگا بٹن آن کر دیں آپ دیکھیں گے کہ کی پیڈ میں لگے سرخ بلب روشن ہو جائیں گے اور ساتھ ہی ڈسکٹ ڈرائیو میں لگا بلب روشن ہو جائے گا۔ اور اس کے ساتھ ہی کمپیوٹر کولڈ اسٹارٹ شروع ہو جائے گا۔

کمپیوٹر اپنے کولڈ اسٹارٹ کے دوران اپنی یاداشت کی جانچ کرتا ہے۔ اگر آپ (Basic) بیسک زبان میں کوئی پروگرام کرنا چاہتے ہیں تو سب سے پہلے (Basic)کو (DOS)ڈسکٹ سے فائل لوڈ کرالیں۔

اور جب (System میں (Basic)لوڈ ہو جائے تو (Basic)زبان کی جو بھی ہدایات آپ کمپیوٹر کو دیں گے وہ عمل کرے گا اور اس طرح سے آپ اپنی مرضی کا کوئی بھی لکھا ہوا پروگرام ڈسکٹ میں محفوظ کر سکتے ہیں۔

SABCOS

Creators of Royal Comforts

SABCOS. Specialized textile unit has the capacity to produce in bulk and shipment on time for the exporters royal range of specialized textiles.

100% COTTON TOWELS:
Royal Velour
Royal Terry (Jacquard)
Royal Uni Colour
Institutional.
BLANKETS ACCRYLIC:
Royal Mink
Royal Fur
Plush Mink
BLANKETS WOOLLEN:
Commercial
Institutional
Army
Woollen Fabrics
COTTON BLANKET:
Cellular
Royal Cotton Blanket

Specially Manufacturing for Japan
Towels
Towelkit
Towelsheet
BATH ROBES 100% COTTON
(Shawl, Collar, Kimono Style)
BABY PRODUCT
Royal Baby Sets.
Royal Baby Blankets.
Royal Baby Bath Robes.
Royal Baby Towelets.

SABCOS (PVT) LTD
MILLS: A/12, SITE, Karachi, PAKISTAN.
Phones: (92-21) 295877, 295334 Fax: 2427427, 297776
Telex: 25284 AYOOB PK, 24293 JAMAL PK
Cable: TAJBAWA
HEAD OFFICE: 45-46 Gordhandas Market
Luxmidas Street, Karachi, Ph: (92-21) 234288, 238751

جو بوؤ گے وہ خود دیکھو گے

علی حیدران ملک

سپین پر مسلمانوں نے تقریباً تین سو سال تک جاہ و جلال سے حکومت کی لیکن آپس کی بندر بانٹ سے وہ زوال کا شکار ہوگئے اور ان کی عظیم سلطنت ٹکڑے ٹکڑے ہوگئی۔ یہ چھوٹی چھوٹی ریاستیں آپس میں لڑتی تھیں اور بعض اوقات ایک دوسرے کے خلاف عیسائی بادشاہ الفانسو سے بھی مدد لیتیں۔ اس طرح الفانسو کو آگے بڑھنے کا موقعہ مل گیا اور وہ ان حکمرانوں کے لئے خطرہ بن گیا۔ ان ریاستوں میں سے ایک ریاست کا نام اشبیلیہ تھا۔ اس ریاست کے درباری معتمد نے بادشاہی معاملات میں درجہ کمال تک عبور حاصل کرلیا تھا اور اس کو شعر و ادب میں ملکہ حاصل تھا۔ اس معتمد کے مشورے سے تمام اسپینی ریاستوں نے مرابطی خاندان کے حکمران "یوسف بن تاشفین" کو افریقہ سے اسپین بلوایا کہ آکر ہماری مدد کریں۔

وہ فوج لے کر اسپین پہنچ گیا تو الفانسو نے اسے ڈرانے دھمکانے کے لئے ایک کھلا خط لکھا جس کا

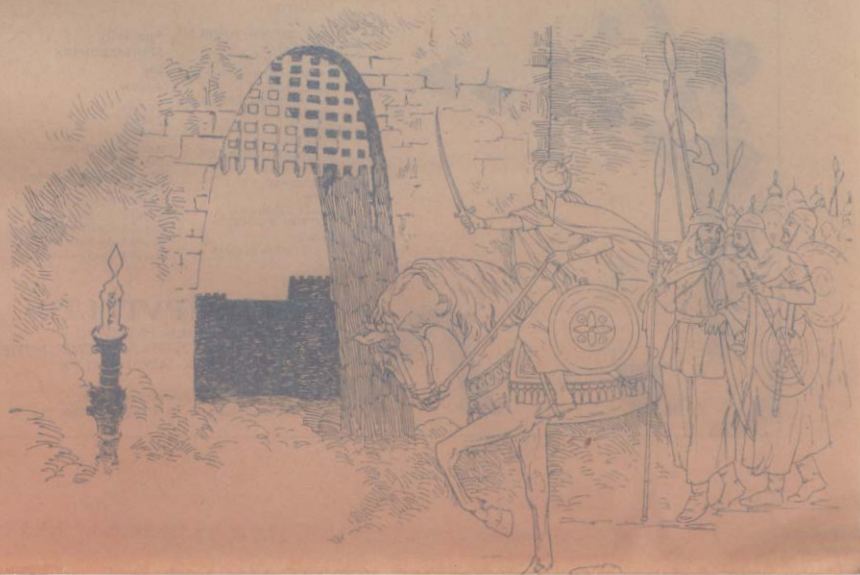

خلاصہ یہ تھا کہ کیوں مفت میں مرنے کے لئے آئے ہو چپ چاپ واپس چلے جاؤ۔ میں مراکش آکر تمہارا شوقِ جنگ پورا کردوں گا۔ یوسف نے اس خط کی پیٹھ پر صرف تین الفاظ لکھے ان الفاظ کا مطلب یہ تھا کہ جو کچھ ہوگا وہ تو اپنی آنکھوں سے دیکھ لے گا۔ الغرض یوسف فوج لے کر آگے بڑھا۔ عرب ریاستوں کے جنگ جو بھی اس کے ساتھ تھے۔ صوبہ بطیوس کے میدان زلاقہ میں الفانسو سے مقابلہ ہوا۔ یوسف اور عرب فوج کی تعداد ۲۰ ہزار اور عیسائی فوج کی تعداد ۶۰ ہزار تھی۔

الفانسو نے یوسف کو پیغام بھیجا کہ جمعہ کا دن تم مسلمانوں کے درمیان مقدس ہے اور اتوار کا دن ہمارے لئے متبرک ہے لہٰذا ان دنوں میں کوئی جنگ نہیں ہوگی۔ یوسف بن تاشفین نے اس تجویز کو منظور کرلیا۔ دراصل یہ ایک فریب تھا۔

عیسائی بادشاہ یہ چاہتا تھا کہ مسلمانوں کو بے خبری میں پاکر اس پر حملہ کردیا جائے۔ چنانچہ جب مسلمان نماز پڑھ رہے تھے تو اچانک الفانسو نے حملہ کردیا۔ یوسف اپنی فوج کو لے کر ایک بلند مقام پر پہنچ گیا اور عرب ریاستوں کی فوج عیسائیوں سے گتھم گتھا کروادی۔ جب یوسف نے دیکھا کہ عیسائی فوج عربیوں سے لڑنے میں مصروف ہے تو وہ پہاڑ کے عقب میں سے ہوتا ہوا عیسائی فوج پر حملہ آور ہوا۔ یہ حملہ اس قدر سخت اور خطرناک تھا کہ عیسائیوں کے چھکے چھوٹ گئے۔ الفانسو کے کیمپ کو آگ لگا دی گئی۔ الفانسو نے شکست کھائی۔ ۲۰ ہزار عیسائی کھیت رہے۔ اس فتح سے مسلمانوں کے لئے اسپین پر مزید چار سو سال تک حکمرانی کے دروازے کھل گئے۔

یہ یوسف بن تاشفین عجیب شخص تھا۔ ایک سو سال عمر پائی۔ اور ایک مرتبہ بھی بیمار نہ ہوا۔ جَو اور جوار کے علاوہ کوئی غذا نہ کھائی۔ بکری کا گوشت، دودھ وغیرہ کو منہ نہ لگایا۔ ہمیشہ ٹاٹ کا لباس پہنا اور زمین پر سویا۔ وہ ۱۱۰۶ء میں فوت ہوا۔

متوازن غذا
صحت کی ضامن

ماہرین غذائیت، غذاؤں کو درج ذیل چار حصّوں میں تقسیم کرتے ہیں

- سبزیاں، پھل اور فروٹ
- اناج، چاول، گندم اور دالیں وغیرہ
- دودھ، مکھن، گھی، پنیر اور دہی وغیرہ
- گوشت، انڈے، مُرغی اور مچھلی وغیرہ

اگر آپ نے دن بھر کی غذاؤں میں ان چاروں حصّوں سے کچھ نہ کچھ کھا لیا تو سمجھ لیجئے کہ آپ نے متوازن غذا کھالی اور آپ کے جسم کو مطلوبہ توانائی میسر آگئی۔

اشتہار برائے ترغیب حفظانِ صحت و تندرستیٔ اطفال - آنکھ مچولی

آئیے!

بڑوں کو سمجھائیں سگریٹ نہ سلگائیں

سگریٹ وہ غیر محسوس زہر ہے جو ہماری زندگی کو گھُن کی طرح چاٹ جاتا ہے اور بالآخر مُوذی امراض اور تکلیف دہ موت کے انجام سے دوچار کرتا ہے۔

سگریٹ نشہ ہے جو ہم سے ہماری فعال اور متحرک زندگی چھین کر ہمیں سستی، کاہلی اور بے ہمتی کے روگ دیتا ہے۔

سگریٹ وہ لت ہے جو مضبوط اردوں اور آہنی عزائم کے قلعوں کو مسمار کر دیتا ہے۔

سگریٹ پینے والے کبھی شاہین صفت نہیں ہو سکتے سگریٹ کا دھواں لگنے والے ہمیشہ صحت مند نہیں رہ سکتے۔

یاد رکھیے ہمارے اطراف جب کوئی سگریٹ پی رہا ہوتا ہے تو اُس کا دھواں اُسی کی رگوں میں اندھیرے نہیں بھرتا بلکہ ہماری سانسوں میں شامل ہو کر ہماری رگ و پے میں بھی اُترتا ہے۔ **تو پھر ـــــ ہم احتجاج کیوں نہ کریں** سگریٹ پینے والے اپنے بزرگوں کو کیوں نہ سمجھائیں کہ سگریٹ انہی کی نہیں ہماری بھی قاتل ہے۔ اچھے لہجے میں، شائستہ طریقے سے مہذب بچّوں کی طرح... آیئے اپنے بڑوں کے ہاتھ سے سگریٹ لے کر پھینک دیں اور ان کی درازیٔ عمر کی دعائیں مانگیں۔ آنکھ مچولی کی "سگریٹ چھوڑ تحریک" میں شامل ہو کر اسے موثر بنایئے۔

خیر ایجنسز ۱۲ میری مینشن فریئر روڈ کراچی

منظور شدہ ڈیلر: پاک سوزوکی موٹرز کمپنی لمیٹڈ۔ سندھ انجینئرنگ (پرائیویٹ) لمیٹڈ
فون کراچی: ۷۷۲۶۲۵۵ - حیدرآباد: ۲۵۲۸۷

گُدگُدے

○ ...... ایک مریض نے کمپاؤنڈر سے کہا "بھائی تمہارے ڈاکٹر صاحب تو ماشاللہ بہت قابل ہیں۔ بڑی شہرت سنی ہے۔ اب تک تو مجھے ایسے ڈاکٹروں سے واسطہ پڑتا رہا ہے کہ اگر مریض ملیریا بتاتا تھا تو اس کا انتقال نمونئے سے ہوتا تھا۔"
کمپاؤنڈر جلدی سے بولا۔ "اس میں کیا شک ہے جناب۔ یہاں ملیریا کا مریض آتا ہے تو اس کا انتقال ملیریا سے ہی ہوتا ہے۔"

مرسلہ ...... ساجد کملاوی، کملیہ

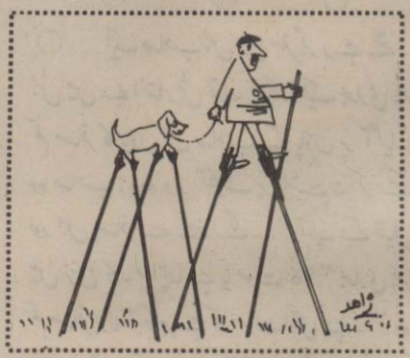

○ ...... ماسٹر (فرید سے) "جماعت میں کون شور کر رہا ہے؟"
فرید۔ "جناب مجھے تو معلوم نہیں میں تو خلیل کے ساتھ باتوں میں مصروف تھا۔"

مرسلہ ...... ثمرین آفتاب، لاہور

انعامی لطیفہ

○ ...... محکمے کا افسر گشت کر رہا تھا کہ نہر میں ایک آدمی کو دیکھ کر رک گیا اور چیخ کر کہنے لگا "سنو! نہر میں تیرنے کی اجازت نہیں ہے"، نہر میں ہاتھ پاؤں مارتے ہوئے آدمی نے کہا۔
"جناب! تیر کہاں رہا ہوں میں تو ڈوب رہا ہوں" افسر نے قدم بڑھاتے ہوئے کہا "پھر ٹھیک ہے۔"

مرسلہ ...... رضوانہ شاہ، میانوالی۔

○ ...... مہمان چھٹا کینو لیتے ہوئے، (میزبان سے) "اجی بس کیا بتاؤں میری نظر تو بہت کم زور ہے۔"
میزبان (جل کر)! جی ہاں! جبھی آپ کینوؤں کو انگور سمجھ کر کھا رہے ہیں۔"

مرسلہ ...... سعدیہ صدیقی لانڈھی، کراچی

○ ...... ○ ...... ○ ......

○ ...... "کیا یہ اچھا صحت افزا مقام ہے؟" مسافر نے پوچھا۔
"جی ہاں! بہت اچھا۔" گائیڈ نے جواب دیا اور کہا۔ "جب میں یہاں آیا تھا تو ایک لفظ بھی نہ بول سکتا تھا۔ میرے سر پر ایک بال بھی نہ تھا۔ میں قدم نہ اٹھا سکتا تھا۔ اور لوگ مجھے اٹھا کر بستر پر ڈالتے تھے۔"

مسافر نے حیران ہو کر پوچھا۔ "واقعی! مگر اب تو بڑے ہٹے کٹے نظر آرہے ہو۔ کتنی مدت گزاری ہے یہاں۔" گائیڈ نے جواب دیا۔ "جناب میں پیدا ہی یہاں ہوا تھا۔"

مرسلہ..... محمد خالد ہارون خان، کراچی

.....○.....○.....○.....

○..... پولٹری فارم کے مالک نے اپنے دوست سے کہا "جب بھی سیلاب آتا ہے سینکڑوں چوزے ڈوب کر ہلاک ہو جاتے ہیں۔ اب تم ہی بتاؤ۔ میں کیا کروں، میں تو قلاش ہوتا جارہا ہوں۔"

دوست نے چند لمحے سوچا پھر بولا "تم ایسا کرو، چوزوں کے بجائے بطخیں پال لو۔"

مرسلہ..... یاسمین ناز، کراچی

.....○.....○.....○.....

○..... ایک عورت اور اس کی بچی بس میں سفر کر رہی تھی۔ بچی آئس کریم کھا رہی تھی۔ بس میں جب بھی جھٹکا لگتا تو آئس کریم سامنے بیٹھے ہوئے آدمی کے کوٹ کو لگتی۔ اس پر عورت نے بچی کو سمجھایا "بیٹے سنبھل کر بیٹھ جاؤ۔ یہ کوٹ مسلسل تمہاری آئس کریم خراب کر رہا ہے۔"

مرسلہ..... طارق محمود انجم، سرگودھا

.....○.....○.....○.....

○..... ایک صاحب بس میں سفر کر رہے تھے۔ بس میں بے انتہا رش تھا۔ اچانک ایک بھاری بھر کم مسافر کا پاؤں ان صاحب کے پاؤں پر آگیا۔ وہ صاحب زیادہ دیر تکلیف برداشت نہ کر سکے اور اس مسافر سے کہنے لگے۔ "آپ کے خیال میں نزع کا عالم اچھا ہے یا موت کا؟" بھاری بھر کم مسافر بولا "ظاہر ہے کہ موت اچھی ہے۔" وہ صاحب تڑپ کر بولے، "تو خدارا آپ اپنا دوسرا پاؤں بھی میرے پاؤں پر رکھ دیں۔"

مرسلہ..... حماد خالد فیاضی، شیخوپورہ۔

.....○.....○.....○.....

○..... ایک آدمی اخبار میں ایک اشتہار پڑھ کر

خوب ہنس رہا تھا۔ دوسرے آدمی نے، جو اس کے قریب ہی بیٹھا تھا، اس سے ہنسنے کی وجہ پوچھی تو وہ شخص کہنے لگا۔ "دیکھئے اخبار میں لکھا ہے کہ "حسین بنئے" بھلا کہیں "بنئے" بھی حسین ہوتے ہیں۔"

مرسلہ ...... حماد خالد فیاضی، شیخوپورہ

○ ...... ایک شخص قصاب سے ...... (ایک مریل سی بکری کو دیکھ کر) "اس بکری کی قیمت کیا ہے؟" قصاب "۱۴۰ روپے!!!" وہ شخص ...... "اتنی قیمت؟"

قصاب "جناب کل تک اس کی قیمت ۴۰ روپے تھی لیکن صبح اس نے ۱۰۰ روپے کھا لئے۔"

مرسلہ ...... عدیل طارق، ڈیرہ اسماعیل خان

...... ○ .... ○ .... ○ ......

○ ...... ایک لڑکے نے ریلوے کے ٹکٹ گھر میں ہاتھ ڈالا اور کہا "بابا جان کا ایک ٹکٹ دیجئے۔"

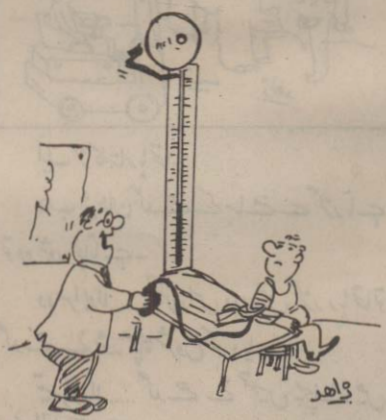

کلرک نے تمام فہرست چھان ماری مگر اسے "با
جان" کا اسٹیشن کہیں نہ ملا۔
اس نے چلا کر پوچھا یہ "بابا جان کہاں ہے؟"
لڑکا بولا "وہ پانی پینے گئے ہیں۔"

مرسلہ ...... محمد افضل ساگر مچھوی، مج

...... ○ .... ○ .... ○ ......

○ ...... باہر کچھ گرنے کی زور دار آواز سن ک
ایک کسان جلدی سے گھر سے نکلا، اس
دیکھا۔ سڑک کے کنارے گھاس کا ایک بڑا
گٹھر گرا پڑا ہے اور بارہ تیرہ سال کا ایک لڑ
قریب ہی کھڑا منہ بسور رہا ہے۔" پریشانی کی کو
بات نہیں برخوردار،" "کسان نے اسے ت
دی۔ "آؤ ...... میرے ساتھ اندر چلو۔ کھا
کا وقت ہے۔ پہلے اطمینان سے کھانا کھاؤ۔ ٹھ
پانی پیو۔ پھر آکر اس گٹھر کو اٹھا ل
گے۔"

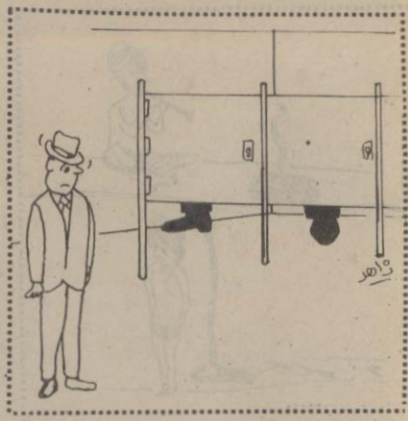

لڑکا اس کے ساتھ اندر گیا۔ ٹھنڈے پانی، کھانے اور چائے وغیرہ سے تواضع کے دوران لڑکا بار بار یہی کہتا رہا۔ "آج تو ابا غصے سے پاگل ہو جائیں گے بہت ماریں گے مجھے۔" "ابا کیوں ماریں گے تمہیں۔؟" کسان نے پوچھا "اس لئے کے وہ باہر گھاس کے گٹھر کے نیچے دبے ہوئے ہیں۔" لڑکے نے معصومیت سے جواب دیا۔

مرسلہ..... محمد نواز، ضلع راولپنڈی

..... ○ ..... ○ ..... ○ .....

○ ..... ایک بچہ بیمار تھا۔ اس کا باپ اسے ڈاکٹر کے پاس لے گیا۔ ڈاکٹر نے دل کی حالت دیکھنے کے لئے آلہ لڑکے کے سینے پر رکھا اور کہا "بیٹا س تک گنتی گنو" یہ سن کر لڑکا گھبرا گیا اور بولا "ابو آپ مجھے پھر اسکول لے آئے۔"

مرسلہ..... صائمہ گل اعوان، بلدیہ ٹاؤن کراچی

..... ○ ..... ○ ..... ○ .....

○ ..... ایک دوست (دوسرے سے) "ہم میلے میں جا رہے ہیں لیکن وہاں کھائیں گے کیا؟" دوسرا "جو سب لوگ کھاتے ہیں" "پہلا کیا؟"

دوسرا "دھکے"

مرسلہ..... محمد ابرار شکیل، کراچی

ایک عورت بڑی پریشان حالت میں ڈاکٹر کے پاس آئی اور کہنے لگی کہ "میری بیٹی کو پتا نہیں کیا ہوگیا ہے۔ آنکھیں گھوم گئیں ہیں چہرہ عجیب طریقے سے کھنچ گیا ہے۔"

ڈاکٹر (اچھی طرح معائنہ کرنے کے بعد) بچی کو کچھ نہیں ہوا، لیکن براہِ کرم اس کی پونی ٹیل ڈھیلی کر دیں۔

جنید اختر، کراچی

ایک لڑکا بتا رہا تھا۔

جب شیطان گدھے کے سامنے سے گزرتا ہے تو وہ شور مچاتا ہے۔

دوسرا بولا..... لیکن اس دن میں گزر رہا تھا تو گدھے نے شور مچانا شروع کر دیا۔

تیسرا بولا..... گدھے نے تمہیں پہچاننے میں کوئی غلطی نہیں کی۔

وقار احمد، کالو کلاں

بحرِ مردار

جس میں ڈوبنا ناممکن ہے

عمر غلام نبی

آپ نے بحیرۂ مُردار کا نام سنا ہو گا۔ لیکن آپ کو شاید یہ معلوم نہ ہو کہ اسے بحیرۂ مُردار کیوں کہتے ہیں۔ اس مضمون میں ہم آپ کو اس سمندر کے بارے میں بتائیں گے۔ بحیرۂ مُردار دراصل ایک جھیل نما سمندر کا نام ہے جس کا پانی بہت زیادہ کھاری ہے۔ پرانی کتابوں میں اس کے کئی نام ملتے ہیں۔ اسے بحیرۂ نمک، بحیرۂ میدان اور بحیرۂ مشرق کے ناموں سے پکارا گیا ہے۔ انگریزی میں اسے (Dead Sea) کہا گیا ہے اور عربی میں یہ بحیرۂ لوط کے نام سے مشہور ہے۔

بحیرۂ مُردار معدنی ذخائر کی دولت سے مالا مال ہے جس کی وجہ سے اس کا پانی بھاری ہو گیا ہے۔ اس کی عالمی شہرت کی بڑی وجہ یہ ہے کہ کوئی بھی چیز چاہے اس کا حجم یا وزن کتنا بھی ہو، اس میں نہیں ڈوب سکتی۔ سمندر یا کئی جھیلوں کا پانی بھی نمکین ہوتا ہے تو آیئے پہلے اس امر کا جائزہ لیں کہ وہ کون سے عناصر ہیں جن کی وجہ سے سمندر کا پانی نمکین ہوتا ہے۔

ان عناصر کے بارے میں ہم زیادہ نہیں جانتے۔ بارش اس سلسلے میں کلیدی رول ادا کرتی ہے۔ اس کے علاوہ اس کا ایک اہم سبب وہ چٹانیں ہیں جو سمندر کی تہہ میں ہوتی ہیں اور سمندر کے پانی میں حل ہو جاتی ہیں۔ اگر تمام سمندروں کے پانی کو خشک کر کے ان سے نمک حاصل کر لیا جائے تو ایک سو اسی میل لمبی اور ایک میل موٹی دیوار کھڑی کی جا سکتی ہے۔ سمندر کے ایک لیٹر پانی میں اوسطاً ۳۰ گرام نمک ہوتا ہے۔ یہ سمندر نما جھیل اُردن میں واقع ہے۔ اس کی لمبائی ۴۶ میل اور چوڑائی ۹ میل ہے۔ یہ سطح سمندر سے ایک ہزار دو سو نوے فٹ بلند ہے۔ اس کا شمالی کنارا ایک ہزار تین سو آٹھ فٹ گہرا ہے۔ یہ جھیل ایک چٹان کے سب سے زیادہ چھوٹے حصے میں واقع ہے جس کی ڈھلوانیں شمال کی طرف وادی اردن سے اور جنوب کی طرف وادی عرب سے بلند ہوتی ہیں۔

بحیرۂ مُردار کے پانی میں سات فیصد سوڈیم کلورائڈ ایک فیصد پوٹاشیم کلورائڈ، اعشاریہ ۴۵ فیصد میگنیشئم برومائڈ اور ۱۱ فیصد میگنیشئم کلورائڈ شامل ہیں۔ بحیرۂ مُردار میں اندازاً دو ہزار ملین ٹن پوٹاش کے اور نو سو ملین ٹن میگنیشئم برومائڈ کے ذخائر شامل ہیں اس کے جنوبی حصے میں جبلِ اژدم کے مقام پر نمک کے ذخائر بھی دریافت ہوئے ہیں۔ اس کے مغربی کنارے پہ نہانے والوں کے لئے تالاب ہے جس میں لوگ ڈوب نہیں سکتے۔

یہ ہے زندگی

کاشف مظہر زاد

ڈوڈیال مانسہرہ میں واقع ایک چھوٹا سا گاؤں ہے جو ایبٹ آباد سے تقریباً ۳۰ کلو میٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ یہ کہانی اسی علاقے کی ہے۔

دسمبر شروع ہو چکا تھا۔ ڈوڈیال میں ہر طرف موسم سرما نے اپنا سکہ جمالیا تھا اور اب دور دور تک برف کے سوا کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ برگد کے درخت کے نیچے چوپالیں، جامع مسجد کا صحن، غرض کہ ایسی تمام جگہیں جہاں گرمیوں میں محفلیں سجا کرتی تھیں، ویران تھیں۔ حتیٰ کہ بچوں کے کھیلنے کا میدان بھی۔ سخت سردی کی وجہ سے بچے بھی زیادہ تر اپنے گھروں میں رہتے تھے۔ اس سرد موسم میں اگر کوئی چیز گرمیوں کی سی رمق دمق کے ساتھ باقی تھی تو وہ گاؤں کا چشمہ تھا۔

ایک صبح ایک لڑکا چشمے کے پاس سے گزر رہا تھا کہ اچانک اس کی نظر ایک لاش پر پڑی۔ قریب جاکر دیکھنے پر پتا چلا کہ وہ گاؤں کا مشکی "رحمت خان" تھا۔ رحمت خان کوئی پچاس کے پیٹے میں تھا۔ صحت اچھی تھی۔ چہرے پر چھوٹی سی ڈاڑھی تھی۔ سر کے بال اگرچہ ابھی کالے ہی تھے مگر ان میں چاندی کے تار واضح طور پر نمایاں تھے۔ رحمت خان کی گزر اوقات کا واحد ذریعہ "پانی" تھا جسے وہ

گاؤں لے جا کر بیچا کرتا تھا۔

رحمت خان کی کل کائنات پانی کے دو کنستر اور ایک بہنگی تھی۔ گاؤں والے اگرچہ غریب نہیں تھے مگر بہت زیادہ امیر بھی نہیں تھے۔ لہٰذا رحمت خان کو ایک کنستر کے صرف تیس پیسے ملا کرتے۔ جس دن وہ بڑی حویلی میں پانی ڈالنے جاتا تو چوہدری اسے روپیہ یا آٹھ آنے بھی دے دیا کرتا تھا۔ رحمت خان، چشمے کے زیادہ سے زیادہ تین چکر لگا پاتا تھا۔ زندگی کے دن جیسے تیسے کٹ ہی رہے تھے۔

رحمت خان کی بیوی "گل بی بی" خاصی شوہر پرست عورت تھی۔ رحمت خان کی کمائی بہت احتیاط سے خرچ کیا کرتی۔ اس کے علاوہ اسے ہفتے میں دو تین روز کپڑے دھونے یا برتن مانجھنے کا کام مل جاتا۔ یہ اضافی آمدنی ان کے اخراجات کو متوازن بنانے میں مدد دیتی تھی۔ وہ چند پیسے بچانے کی خاطر لوگوں کے ساتھ چھوٹے موٹے دھوکے بھی کیا کرتی اور ان کے کپڑے اور برتن کم سے کم پانی میں دھوتی۔

مگر اب یہ سب کچھ ختم ہو چکا تھا۔ رحمت خان مر گیا تھا، اس کی موت کا سبب جلد ہی معلوم ہو گیا۔ وہ چشمے سے پانی لانے کے لئے پہاڑی پر چڑھ رہا تھا کہ برف کی وجہ سے اس کا پاؤں پھسلا، اور وہ سر کے بل ایک نوک دار پتھر سے ٹکرانے کے باعث موقع پر ہی جاں بحق ہو گیا۔

گل بی بی نے اپنی معصومیت میں سوچا کہ کہیں اسے یہ اس کے دھوکوں کا صلہ تو نہیں ملا مگر جلد ہی اسے خیال آیا کہ اس میں اس کا کوئی قصور نہیں۔ اور کوئی بھی شخص اس طرح گر کر ہلاک ہو سکتا ہے۔

عام طور پر جب کسی خاندان کا سربراہ اس جہانِ فانی سے کوچ کرتا ہے تو اپنے پیچھے اتنا سرمایہ چھوڑ جاتا ہے کہ اس کے گھر والے چند روز سکھ کی زندگی گزار سکیں۔ لیکن رحیمو کی کل کائنات تو ایک بہنگی اور پانی کے دو کنستر تھے۔ اور یہی بات گل بی بی کو کھائے جا رہی تھی کہ اب آئندہ زندگی میں کیا ہو گا۔

اور علاقوں کی طرح ڈوڈیال کی بھی روایت ہے کہ اگر کسی گھر میں موت کا سانحہ ہو جائے تو گاؤں والے باری باری اس گھر میں کھانا بھجواتے ہیں۔ رحمت خان کے انتقال کے دوسرے روز بڑی حویلی سے نوکرانی طشت بھر کر مختلف انواع کی اشیائے خورد و نوش لے کر آئی۔ ان لوگوں کا (گل بی بی اور اس کے دونوں بیٹوں کا) دل اگرچہ کھانے کی طرف ذرا سا بھی مائل نہیں تھا مگر جوں ہی طشت پر سے کپڑا ہٹایا تو بھنے ہوئے مرغ، چاول اور طرح طرح کی مٹھائیاں دیکھ کہ ان سے رہا نہ گیا اور وہ اپنا غم بھول کر اپنی بھوک مٹانے لگے۔ رات کو بھی حویلی سے آیا ہوا کھانا، جو دن میں بچ گیا تھا، اس سے اپنے پیٹ کی دوزخ بجھائی، یہ سلسلہ اگلے دو ہفتوں تک جاری رہا۔

مگر دو ہفتے گزر جانے کے بعد یہ سلسلہ بالکل ختم

ہو گیا۔ پندرھویں دن سہ پہر تک ان کے یہاں کہیں سے کچھ نہیں آیا تو گل بی بی نے کچھ آلو ابال لئے۔ مگر ان دو ہفتوں میں وہ مرغن غذاؤں کے عادی ہو گئے تھے لہٰذا وہ آلو حلق سے اتارنا تینوں کے لئے بڑا مشکل ہو گیا۔ بھوک بڑی ہی ظالم شے ہوتی ہے چنانچہ انہیں آلو پر ہی اکتفا کرنا پڑا۔ چند روز گزر جانے کے بعد آلوؤں کا ذخیرہ بھی ختم ہو گیا، تو گھر میں رکھی سوکھی روٹی پانی میں بھگو کر پیاز اور مرچوں کے ساتھ تینوں نے اپنی بھوک مٹائی۔ دو دن یوں اور گزر گئے۔

اس دوران گل بی بی کا ذہن دو بڑی الجھنوں کا شکار تھا۔ ایک تو یہ کہ اب وہ گزارا کیسے کریں گے؟ کپڑے دھونے کا کام بھی گاؤں والے اس لئے نہیں دے رہے تھے کہ ان کے خیال میں گل بی بی سے کام کرانا مناسب بات نہیں تھی۔ دوسری، سب سے بڑی مشکل پانی کی تھی۔ گل بی بی کو رہ رہ کر یہ خیال آرہا تھا کہ پانی جسے رحمت خان کی زندگی میں وہ بے تحاشہ استعمال کرتی تھی، اسے عام لوگوں کی طرح خریدنا پڑے گا۔ اس کو زندگی میں پہلی دفعہ پانی سے شدید نفرت کا احساس ہوا۔

حالات دن بدن خراب ہوتے جارہے تھے۔ بالآخر وہ دن بھی آیا جب گل بی بی کے پاس خود کھانے یا اپنے بچوں کو کھلانے کے لئے کچھ بھی نہ تھا۔ اس روز وہ لوگ بھوکے سوئے۔ اگلی صبح جب گل بی بی کی آنکھ کھلی تو چاہنے کے باوجود بستر سے نہ اٹھ سکی۔ محلے میں زندگی کے معمولات جاری تھے اور لوگ اپنے روز مرہ کے کاموں پر جا رہے تھے۔ اسی اثنا میں گلی میں سے روٹی والا اپنی سائیکل پر گزرا جو گاؤں کے مخصوص گھروں میں روٹیاں تقسیم کیا کرتا تھا۔ گل بی بی کا چھوٹا لڑکا منہ ہی منہ میں بولا، "..... روٹی....." بڑے بیٹے نے گل بی بی کی طرف حسرت بھری نگاہوں سے دیکھا اور پھر منہ پھیر لیا۔ گل بی بی نے سوچا کہ وہ روٹی والے سے مطالبہ کرے کہ وہ انہیں کچھ روٹیاں ادھار دے دے۔ اپنی ساری توانائی جمع کر کے دروازے کے نزدیک پہنچی مگر جب تک روٹی والا سائیکل پر تھوڑا آگے نکل گیا تھا۔ گل بی بی کی نظر جب سائیکل کے پیچھے رکھی ہوئی لال لال خستہ روٹیوں پر پڑی اور روٹیوں کی خوشبو اس کے نتھنوں میں آئی تو ایک مسرت کا احساس اس کے اندر پیدا ہوا۔ اس نے روٹی والے کو آواز دی مگر وہ گل بی بی کی نقاہت بھری آواز سن نہیں سکا اور آگے نکل گیا۔ گل بی بی نے اپنے پیچھے زور سے دروازہ بند کیا اور اندر چلی آئی۔ اس کے خالی ہاتھ دیکھ کر اس کے بچوں نے منہ دوسری طرف پھیر لئے۔ گل بی بی کو اپنے خالی ہاتھ دیکھ کر بہت شرمندگی ہوئی مگر وہ بے بس تھی، وہ دن بھی فاقے میں گزرا۔

اگلے روز جب گل بی بی بیدار ہوئی تو اس کا چھوٹا لڑکا درد سے کراہ رہا تھا۔ ماں کو اپنی طرف

متوجہ پا کر اس نے کہا، "..... ماں، میرے پیٹ میں بہت درد ہو رہا ہے۔" گل بی بی نے کہا، "..... کوئی بات نہیں میرے لعل۔ صبر کرو۔ ایسا بھوک کی وجہ سے ہو رہا ہے....." لڑکا دوبارہ بولا، "..... ماں، میرے پیٹ میں آگ سی لگی ہے۔ لگتا ہے کہ کوئی چیز اندر ہل رہی ہے....." "بیٹا برداشت کرو۔ بھوک کی وجہ سے آنتیں ہل رہی ہیں۔ ابھی کچھ کھانے کا انتظام ہوتا ہے۔" گل بی بی نے اسے چمکارتے ہوئے کہا۔ گل بی بی کی تسلی سے لڑکے کی حالت میں کوئی افاقہ نہیں ہوا بلکہ وہ مزید زور زور سے کراہنے لگا۔ گل بی بی نے آنکھوں آنکھوں میں اپنے لڑکے کو کچھ اشارے کئے۔ بڑے لڑکے نے اپنا پرانا کوٹ پہنا جو کہ کئی جگہ سے پھٹ چکا تھا۔ کوٹ اتنا بوسیدہ تھا کہ باہر کی سردی کا مقابلہ بالکل بھی نہیں کر سکتا تھا مگر پھر بھی لڑکے نے کوٹ پہنا اور باہر نکل گیا۔

باہر انتہائی تیز و سرد ہوائیں چل رہیں تھیں اور لڑکے کے کوٹ کو چیرتی ہوئی اس کے جسم میں اترتی جا رہی تھیں۔ لڑکے کے لئے سردی برداشت کرنا ناممکن تھا مگر وہ کسی نہ کسی طرح گرتا پڑتا لڑکھڑاتا پنواری کی دکان تک پہنچ گیا۔ دکان کا مالک جان محمد تھا۔ باہر کے مقابلے میں دکان خاصی گرم تھی۔ اس نے جان محمد سے دو کلو آٹا اور تین کلو چاول تولنے کو کہا اور جیب میں ہاتھ ڈالا، جیسے پیسے نکال رہا ہو۔ پھر خود ہی بڑبڑایا، "میں بھی کیسا پاگل ہوں، پیسے گھر بھول آیا ہوں۔ اتنی سردی میں دوبارہ جانا آنا مشکل ہے۔ آپ سامان دے دیجئے۔ پیسے کل مل جائیں گے۔" جان محمد بڑا کائیاں تھا۔ غریبوں کی اس قسم کی چالاکیوں سے واقف تھا۔ کہنے لگا، "جن کے پاس پیسے ہوتے ہیں وہ تمہاری طرح کمزور نہیں ہوتے۔ جاؤ پہلے پیسے لے کر آؤ۔ پھر سامان لے جانا۔"

بڑا لڑکا یہ سن کر دکان سے باہر نکل آیا تو جان محمد اپنے مددگار سے کہنے لگا، "آہ! بیچارے اب یہ کس طرح رہیں گے۔"

بڑا لڑکا بڑی مشکلوں سے سرد ہواؤں کا مقابلہ کرتے گھر پہنچا اور جاتے ہی اپنے بستر پر لیٹ گیا جو کہ ابھی تک گرم تھا۔ وہ بری طرح کانپ رہا تھا۔ اس نے گل بی بی سے کہا، "ماں، مجھے کوئی اوڑھنے کی چیز دے دو، میں سردی سے مر رہا ہوں۔"

گل بی بی نے جلدی سے اس کو کمبل اوڑھا دیا مگر اس کی سردی کم نہ ہوئی۔ گل بی بی نے گھر میں موجود تمام چادریں اور کمبل اس کے اوپر ڈال دیئے مگر کوئی فرق نہیں پڑا۔ تھوڑی ہی دیر بعد بڑے لڑکے کو بخار چڑھ گیا جو کہ لمحہ بہ لمحہ تیز ہوتا گیا۔ وہ بخار میں نہ جانے کیا ہذیان بک رہا تھا۔ اس کا چھوٹا بھائی اپنی بھوک بھول کر اپنے بھائی کو دیکھنے لگا۔ گل بی بی کے بڑے لڑکے کی حالت لمحہ بہ لمحہ خراب ہو رہی تھی۔ وہ مسلسل چھت کو گھور رہا تھا اور اس کی آنکھیں ایک جگہ ٹکی ہوئی تھیں جیسے وہ خلا

میں کسی چیز کو دیکھ رہا ہو۔ اس کا بخار انتہائی تیزی سے بڑھ رہا تھا اور وہ اتنی ہی تیزی کے ساتھ موت کے منہ میں جا رہا تھا۔ اپنے بڑے بھائی کی حالت دیکھ کر گل بی بی سے اس کے چھوٹے لڑکے نے، بہت آہستہ سے، اتنی آہستہ کہ بڑا لڑکا نہ سن سکے، کہا، "..... ماں، کیا بھائی مر جائے گا؟" گل بی بی نے حیرت سے اسے دیکھا اور پوچھا، "مگر تم نے یہ بات کیوں پوچھی؟" چھوٹے لڑکے نے جواب دیا، "جب بھائی مر جائے گا تو بڑی حویلی سے کھانا آئے گا نا!!!"

(مرکزی خیال، ترکی مصنف "قدرت جودت" کی کہانی سے اخوذ)

The First name in Bicycles, brings ANOTHER FIRST

SOHRAB VIP sports

Sohrab the leading national bicycle makers now introduce the last word in style, in elegance, in comfort, absolutely the last word in bicycles.

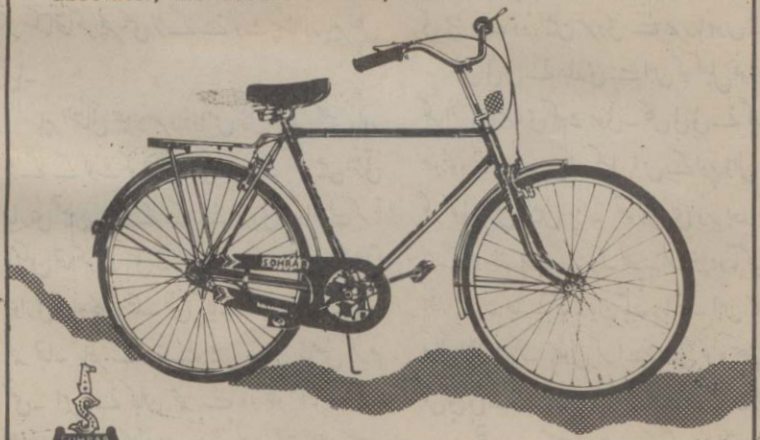

PAKISTAN CYCLE INDUSTRIAL COOPERATIVE SOCIETY LIMITED
National House, 47 Shahrah-e-Quaid-e-Azam Lahore Pakistan.

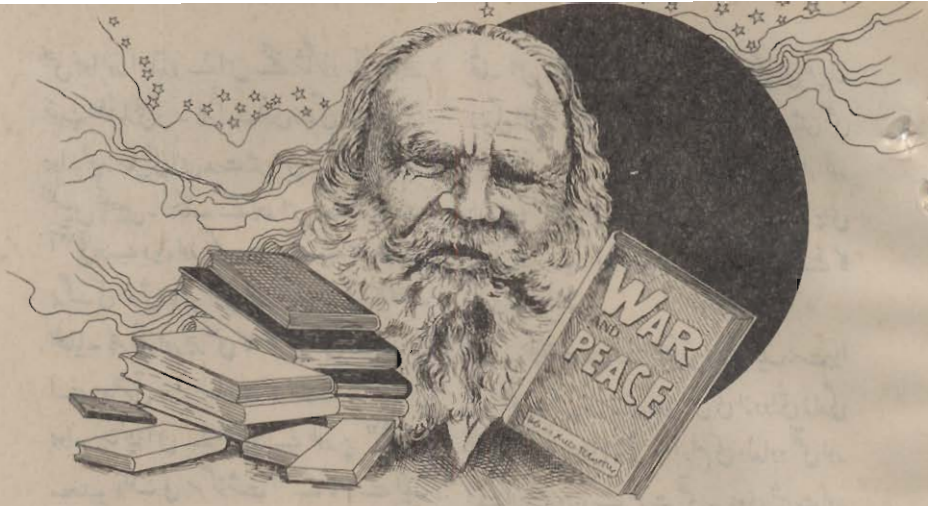

کاؤنٹ لیو ٹالسٹائی

محمد سلیمان خان سنبل

ٹالسٹائی روس کا ایک عظیم مصنف اور ناول نگار تھا۔ وہ اتنا ہر دلعزیز شخص تھا کہ اس کی وفات سے بیس برس پہلے اس کے دروازے پر عقیدت مندوں کا ہجوم لگا رہتا تھا۔ ہزاروں لوگ دور دور سے یہ خواہش دل میں لئے وہاں آتے تھے کہ اس کی ایک جھلک دیکھ لیں، یا اس کی باتیں سن سکیں یا اس کے ہاتھ کو بوسہ دے سکیں۔ اس کے دوست مسلسل کئی برس تک اس کے گھر پر ڈیرہ ڈال کر رہا کرتے تھے اور اس کی زبان سے نکلنے والا ہر لفظ قلمبند کر لیتے تھے۔ یہاں تک کہ وہ عام بات چیت میں اپنی زندگی کا کوئی معمولی سے معمولی واقعہ بھی سناتا تو وہ صفحۂ قرطاس پر رقم ہو جاتا۔ بعد میں ان تمام واقعات کو موٹی موٹی جلدوں کی شکل میں شائع کیا گیا، اس شخص کی زندگی اور نظریات کے بارے میں کم و بیش ۲۳ ہزار کتابیں اور ۵۶ ہزار مضامین لکھے جا چکے ہیں۔ اس کی اپنی نگارشات کی ایک سو دس جلدیں ہیں۔ ایک شخص کے لئے اتنا زیادہ لکھنا ایک معجزے سے کم نہیں۔

کاؤنٹ لیو ٹالسٹائی ۹ ستمبر ۱۸۲۸ء کو روس کے صوبے "تولا" میں ۴۲ کمروں کی ایک شاندار حویلی میں پیدا ہوا، جائے پیدائش کا نام "لینا یا پولیانا" تھا۔ اس کے آس پاس دولت کے انبار تھے۔ اس نے قدیم روسی رئیسوں کی طرح شاہانہ ٹھاٹھ باٹ سے پرورش پائی، نوجوانی میں وہ بہت خوش لباس تھا، ماسکو کے اچھے اچھے درزیوں کی دکانوں کا طواف کرتا رہتا اور زمین پر بہت نزاکت سے بچے تلے قدم رکھتا۔ ۱۸۴۴ء سے ۱۸۴۷ء تک کازان یونیورسٹی میں تعلیم پائی۔ وہ کالج میں فیل

بھی ہوا اور اساتذہ نے اس نکتے شاگرد کے ساتھ خوب مغزماری کی۔ پھر اسے فوجی زندگی کا تجربہ بھی ہوا۔ چار سال کی اس مدت میں اس نے کئی ناول اور نظمیں لکھیں۔ جنگ کے بعد اس نے فوج سے استعفیٰ دے دیا، اور کچھ مدت کے لئے سینٹ پیٹرز برگ کی خوش باش ادبی اور مجلسی زندگی کا لطف اٹھایا۔ پھر اٹلی اور جرمنی کا سفر کیا جس کے دوران اسے معاشرتی عدم مساوات کا نہایت گہرا احساس ہوا۔ چنانچہ اس نے احتجاج کے طور پر "شہزادہ مخلیو داف کی سرگزشت" کے نام سے ایک کتاب لکھی۔

۱۸۶۲ء میں اس نے ایک اٹھارہ سالہ لڑکی "سوفی بہرس" سے شادی کی اور اس سے ٹالسٹائی کو اپنے سب سے بڑے ناول "اینا کیرے نینا" جس کا مطلب خودکشی ہے کا مواد حاصل ہوا۔ جس میں اس نے ایک ناخوشگوار شادی کی المیہ کہانی لکھی ہے۔ دس سال پہلے اس نے نپولین کی روسی مہم کا حال "وار اینڈ پیس" کے نام سے لکھا تھا یہ وہ ناول ہے جس نے اس کو دنیا کے بڑے ناول نگار کی حیثیت سے مشہور کر دیا۔ اس کے یہ دونوں ناول دنیا بھر کے کالجوں میں پڑھائے جاتے ہیں۔ مردوں اور عورتوں کے درمیان جو نفسیاتی مشکلات پیدا ہوتی ہیں اور جنگ کی وجہ سے جو اذیت ناک کشمکش رونما ہوتی ہے، اس کو دنیا کے کسی مصنف نے ٹالسٹائی سے زیادہ حسن و خوبی سے بیان نہیں کیا۔ ٹالسٹائی روس کے مظلوم کسانوں کا بڑا حامی تھا۔ اس نے اواخر زندگی میں کسانوں کی سی غریبانہ زندگی اختیار کرلی۔ پھر متروجہ عیسائی عقائد میں بھی اصلاح کی اور اسے انجیل کے مطابق بنایا، اور ناداری، مسکینی اور عدم مزاحمت کو سب سے بڑی نیکیاں قرار دیا۔ وہ امن اور عدم تشدد کے فلسفے کا بہت بڑا مبلغ تھا۔

یہ حقیقت ہے کہ ٹالسٹائی کی زندگی ایک بہت بڑا المیہ تھی۔ اس کی بڑی وجہ اس کی ازدواجی زندگی تھی۔ اس کی بیوی عیش و آرام کی دلدادہ تھی اور اسے ان چیزوں سے نفرت تھی۔ بیوی شہرت اور وقار کی بھوکی تھی اور ٹالسٹائی کے نزدیک ان کی کوئی وقعت نہ تھی، اس کی بیوی کو دولت سے محبت تھی جبکہ ٹالسٹائی دولت جمع کرنے کو گناہ خیال کرتا تھا۔ ٹالسٹائی کے مطابق اس کی بیوی نے گھر کو جہنم کا نمونہ بنا دیا تھا۔ اس سارے فساد کی جڑ یہی تھی کہ ٹالسٹائی روسی عوام کے لئے بلامعاوضہ کتابیں لکھنا چاہتا تھا۔ آخر کار جب وہ بیاسی برس کا ہوا تو اس میں اتنی ہمت نہ رہی کہ اپنے ناخوشگوار گھریلو حالات کا مزید مقابلہ کرسکے۔ چنانچہ ۲۱ اکتوبر ۱۹۱۰ء کی ایک تاریک اور سرد رات کو گھر سے نکل گیا یہ جانے بغیر کہ اس کی منزل کہاں ہے۔ گیارہ دن بعد وہ نمونیے کا شکار ہوگیا اور یہ کہتا ہوا ایک ریلوے اسٹیشن پر فوت ہوگیا کہ "اللہ مسبب الاسباب ہے۔"

اس کے آخری الفاظ یہ تھے "جستجو..... مسلسل جستجو"۔

امتحان ہے آپ کی ذہانت کا!

ادارہ

اس ماہ سے ہم ایک نیا انعامی مقابلہ "امتحان ہے آپ کی ذہانت کا" کے عنوان سے شروع کر رہے ہیں۔ اس میں حسابی نوعیت اور کامن سینس کے سوالات پوچھے جائیں گے۔ ہم ہر ماہ آپ سے صرف چار سوالات پوچھیں گے۔ بالکل صحیح جوابات ارسال کرنے والے ذہین ساتھی کو ایک عدد کیلکولیٹر انعام کے طور پر دیا جائے گا۔ صحیح جوابات زیادہ موصول ہونے کی صورت میں فیصلہ بذریعہ قرعہ اندازی کیا جائے گا۔ یاد رکھئے جوابات وصول کرنے کی آخری تاریخ ماہ رواں کی ۱۲ تاریخ ہے۔ تاخیر سے موصول ہونے والے خطوط کو مقابلے میں شامل نہیں کیا جائے گا۔ جوابات بالکل الگ کاغذ پر الگ لفافے میں، واضح، صاف اور خوش خط لکھے ہوئے ہوں۔ یعنی اس میں کہانی، نظم، لطائف پہیلیاں وغیرہ نہ ہوں البتہ اپنا مکمل پتہ ضرور تحریر کیجئے۔ جن جوابات کے ساتھ مکمل پتہ نہیں ہوگا وہ بھی مقابلے میں شامل نہیں کئے جائیں گے۔ خط لکھنے کے لئے ہمارا پتہ ہے۔

انچارج انعامی مقابلہ، "امتحان ہے آپ کی ذہانت کا" ماہنامہ آنکھ مچولی ۱۔ پی آئی بی کالونی، کراچی۔ ۷۴۸۰۰۔

۱..... جعفرات کو دیر تک کام کرنے کی وجہ سے شدید تھکن محسوس کر رہا تھا۔ اتفاق سے اس کا ہاتھ تپائی پر رکھے ہوئے ٹائم پیس سے ٹکرایا اور ٹائم پیس دھڑام سے فرش پر جا گرا اور اس کے ڈائل کے تین ٹکڑے ہوگئے۔ ڈائل کچھ اس طرح ٹوٹا کہ اس کے ہر حصے کے نمبروں کو جمع کرنے سے بالترتیب ۲۵، ۲۶، ۲۷، کا مجموعہ حاصل ہوتا ہے آپ یہ بتائیے کہ ڈائل کس ترتیب سے ٹوٹا؟

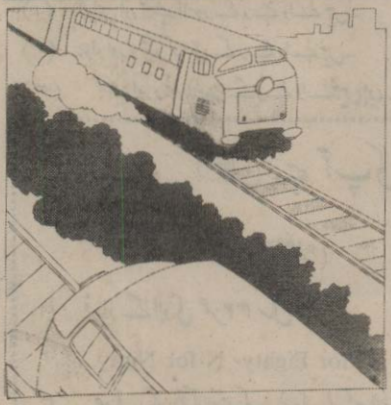

۲..... دو قصبے نور پور اور مبارک پور ایک دوسرے سے ۴۶۷۹ کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہیں۔ دو ٹرینیں نور پور سے مبارک پور اور مبارک پور سے نور پور کے لئے چلتی ہیں جن کی رفتار بالترتیب ۶۷ کلومیٹر فی گھنٹہ اور ۸۳ کلومیٹر فی گھنٹہ ہے۔ آپ یہ بتائیے کہ دونوں گاڑیاں آپس میں ملنے سے ایک گھنٹہ پہلے ایک دوسرے سے کتنے فاصلے پر ہوں گی؟

۳..... جواد، الیاس، رشید، جمشید اور رہبر پانچ دوست ہیں۔ ان میں سے دو کا تعلق لاہور سے ہے اور دو کراچی کے رہنے والے ہیں۔ اگر مندرجہ ذیل جملوں میں سے ہر جملے کا آدھا حصہ سچ ہو تو بتایئے رہبر اور جمشید کس شہر سے تعلق رکھتے ہیں؟

(۱) الیاس اور جمشید لاہور کے رہنے والے ہیں۔

(۲) جواد اور رشید کراچی کے رہنے والے ہیں۔

(۳) جمشید اور رہبر لاہور کے رہنے والے نہیں ہیں۔

۴..... جمیل، کریم اور تنویر نے بالترتیب ۲۳، ۳۰، اور ۳۷ سیب خریدے۔ سیب دو مختلف سائز میں یعنی چھوٹے اور بڑے ہیں۔ ہر ایک نے اپنے سیبوں کی قیمت ۱۶ روپے ادا کی ذرا بتایئے تو یہ کیسے ممکن ہوا؟

جوابات..... امتحان ہے آپ کی ذہانت کا

(نومبر ۱۹۹۲ء)

۱..... فرہاد کے ابو کی عمر ۴۲ سال ہے۔

۲..... E for Eighty- N for Ninty.

۳..... صرف تاریخ کو پسند کرنے والے ممبران کی تعداد ۱۰ ہوگی۔

۷۵۲ - ۲۷۲ = ۴۶۵ - ۱۰

۴..... ٹیم نمبر ۱ ـــــ جاوید، ارشاد، انور

ٹیم نمبر ۲ ـــــ دانیال، جمال، فرید

ٹیم نمبر ۳ ـــــ پرویز، جمیل نعیم

بادل، ہوا اور شہزادی

سید نظر زیدی

بہت پرانے زمانے کی بات ہے ایک ملک پر بہت ظالم بادشاہ حکومت کرتا تھا۔ شیطان نے اس کے دل میں یہ بات بٹھا دی تھی کہ اس کا خاندان اور وہ خود ساری دنیا میں سب سے اچھا ہے۔ وہ یہ بات بھول ہی گیا تھا کہ دنیا میں بسنے والے سب انسان چاہے وہ کسی بھی ملک میں رہتے ہوں اور چاہے ان کا رنگ گورا ہو یا کالا۔ ایک ہی ماں حضرت حوا اور ایک ہی باپ حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد ہیں۔ عزت اور بڑائی صرف ان لوگوں کو ملتی ہے جو اچھے کام کرتے ہیں۔

ایسے خیالات کو جیسے اس بادشاہ کے تھے، نسلی اور خاندانی بڑائی کا پاگل پن کہتے ہیں اور جن لوگوں میں یہ پاگل پن پیدا ہو جاتا ہے وہ بے انصاف اور ظالم بن جاتے ہیں، چنانچہ یہ بادشاہ بھی ایسا ہی تھا۔ حکومت کے سارے عہدوں پر اس نے اپنے خاندان کے لوگوں کو مقرر کر دیا تھا۔ جب کوئی عہدہ خالی ہوتا تھا تو وہ صرف یہ دیکھتا تھا کہ جسے اس عہدے پر مقرر کر رہا ہے اس کا تعلق اس کے

خاندان سے ہے یا نہیں! اس بات پر غور ہی نہ کرتا تھا کہ وہ آدمی اس قابل اور نیک دل بھی ہے یا نہیں۔

بادشاہ کے اس پاگل پن کی وجہ سے حکومت کے سبھی عہدوں پر ایسے لوگ کام کر رہے تھے جو بادشاہ ہی کی طرح ظالم بے انصاف اور جاہل تھے۔ اور اس کا نتیجہ یہ نکلا تھا کہ ملک کے سارے کام بگڑ گئے تھے۔ فوج کے افسر اور سپاہی فوجی ہنر سیکھنے کے بجائے پتنگیں ہانکتے رہتے تھے۔ پولیس والے رشوت لینے کے نئے نئے طریقے سوچتے رہتے تھے اور دفتروں میں کام کرنے والے ایسے بے پرواہ ہوگئے تھے کہ زیادہ وقت اپنے گھروں پر گزارتے تھے۔ بہت ہوا تو ایک آدھ چکر دفتر کا بھی لگا لیا۔

اس پورے ملک میں بس غریب کسان اور مزدور ایسے تھے جو اپنے کام محنت اور ایمانداری سے کرتے تھے، لیکن ان کی محنت اور ایمانداری سے بھی ملک کو کچھ فائدہ نہ پہنچتا تھا وہ جو کچھ کماتے تھے سرکاری افسران ان سے چھین کر لے جاتے تھے۔ ان کے بچوں کے لئے بھی کچھ نہ چھوڑتے تھے۔

ایک بار ایسا ہوا کہ ایک غریب کسان دھان کی فصل کاٹ کر اپنے گھر لایا تو ساتھ ہی سرکاری پیادے بھی آگئے اور سارے دھان چھکڑے میں لاد کر لے گئے۔ کسان نے انہیں ایسا کرنے سے روکا تو پیادوں نے اسے اس قدر مارا کہ بیچارہ بے ہوش ہوگیا۔ اس کے گھر والے رونے پیٹنے لگے، لیکن ظالم بادشاہ کے ظالم پیادوں کو ان پر رحم نہ آیا۔ کسان اور اس کے گھر والوں کو اس حالت میں چھوڑ کر چلے گئے۔

اب ہوا یہ کہ جس وقت ظالم بادشاہ کے پیادے کسان کو بیدردی سے پیٹ رہے تھے اور اس کی فصل کے دھان چھین کر لے جا رہے تھے۔ بادل کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا کسان کے گھر کے بالکل اوپر ہوا میں تیر رہا تھا۔ زمین پر بارش برسانے والے فرشتے میکائیل نے اللہ پاک کے حکم سے بادل کے اس ٹکڑے کو اس گاؤں کے کھیتوں پر بارش برسانے کے لئے بھیجا تھا جس میں اس غریب کسان کا گھر تھا۔

ہوا اور بادل کے ٹکڑے نے جو کسان پر یہ ظلم ہوتے دیکھا تو انہیں بہت رنج ہوا۔ ہوا ٹھنڈی سانس لے کر بولی۔ "بادل بھائی، بادل بھائی، میرا دل چاہتا ہے تم اس گاؤں کے کھیتوں پر بارش نہ برساؤ، اس میں جو لوگ رہتے ہیں وہ بہت ظالم ہیں اور ظالموں کے کھیتوں میں اچھی فصلیں اُگیں گی تو وہ کمزوروں اور غریبوں کو اور ستائیں گے۔"

"لیکن ہوا بہن! اس گاؤں میں تو غریب کسان اور مزدور رہتے ہیں، تم ان بیچاروں کو ظالم کیوں کہہ رہی ہو؟" بادل نے کہا۔

ہوا جلدی سے بولی۔ "میں انہیں ظالم اس لئے کہہ رہی ہوں کہ جس وقت بادشاہ کے پیادے غریب کسان کے دھان چھین رہے تھے اور بہت بیدردی سے اسے پیٹ رہے تھے تو انہوں نے اس

کی مدد نہیں کی۔ چپ چاپ دیکھتے رہے۔ مجھے یقین ہے اگر یہ اس کی مدد کے لئے آگے بڑھتے تو ظالم پیادے ڈر کر فوراً بھاگ جاتے۔ اپنا فرض پورا نہ کرنے کی وجہ سے یہ سب ظالم بادشاہ اور اس کے پیادوں کے ساتھی بن گئے اور انصاف کے مطابق ان کا نام بھی ظالموں میں لکھا گیا۔"

"تمہاری بات تو ٹھیک ہے ہوا بہن، لیکن یہ تو سوچو کہ اگر میں اس گاؤں کے کھیتوں پر نہ برساتو سخت قحط پڑ جائے گا اور ہزاروں بے گناہ بھوکے مر جائیں گے۔ تم دیکھ رہی ہو کسان نے کھیت تیار کر کے بیج بکھیر دیئے ہیں اور اس وقت انھیں بارش کی بہت ضرورت ہے!" بادل نے دھیرے سے گرج کر کہا۔

"جو کچھ بھی ہو! لیکن میں تو یہی کہوں گی کہ ان کے کھیتوں پر پانی کی ایک بوند بھی نہ برساؤ۔ ایسے لوگوں کو سزا ملنی چاہئے جو خدا کو بھول گئے ہیں۔" ہوا اب غصے سے پھنکار رہی تھی۔

یہ بات سن کر بادل کچھ دیر چپ رہا۔ پھر بولا۔ "اچھا بہن! اگر تمہارا یہی مشورہ ہے تو میں نہیں برستا۔"

ظالم بادشاہ اپنے بہت سجے ہوئے دربار میں سونے کے اونچے تخت پر شان سے بیٹھا تھا۔ اس کے وزیروں اور امیروں کی کرسیاں بھی بہت شاندار تھیں اور سبھی گردنیں اکڑائے اپنی اپنی جگہ یوں بیٹھے تھے جیسے وہی دنیا میں سب سے اچھے ہوں۔

بادشاہ نے وزیر اعظم کی طرف دیکھ کر کہا۔

"ہمارے دارالحکومت سے ذرا دور کالے پتھروں کا جو پہاڑ ہے ہم چاہتے ہیں اس پر سفید رنگ کا ایک بہت بڑا محل بنوائیں۔ وزیر اعظم، اس بارے میں تمہاری کیا رائے ہے؟"

"یہ ارادہ تو بہت ہی مبارک ہے شہنشاہ عالی مقام، یہ خادم تو خود سوچ رہا تھا کہ علی جاہ کا محل کسی ایسی جگہ ہونا چاہئے کہ دشمن وہاں آسانی سے نہ پہنچ سکے۔ کالے پہاڑ پر محل بنانا بہت ضروری ہے۔" وزیر اعظم نے خوشامد بھری آواز میں کہا۔

"تو بس ٹھیک ہے، محل بنانے کا کام کل ہی سے شروع ہو جانا چاہئے۔ اس محل پر جو خرچ اٹھے گا اسے پورا کرنے کے لئے ملک کے کسانوں پر ایک نیا ٹیکس لگا دیا جائے۔ ہمیں بتایا گیا ہے اس سال خوب بارشیں ہوں گی اور بہت عمدہ فصلیں اُگیں گی، کیا ہماری یہ بات ٹھیک ہے؟" بات ختم کر کے ظالم بادشاہ نے درباریوں کی طرف دیکھا اور اس کے سوال کے جواب میں سبحان اللہ، سبحان اللہ، واہ واہ واہ واہ کا شور مچ گیا۔ سب درباریوں نے کھڑے ہو کر باری باری بادشاہ کی اس بات کو ٹھیک بتایا اور محل کو زیادہ سے زیادہ شاندار بنانے کے لئے کہا۔

ایک امیر بولا "شہنشاہ عالی مقام، میری تجویز تو یہ ہے کہ اس محل کی سیڑھیاں چاندی کی بنائی جائیں۔ دیواروں پر سونے سے پھول بوٹے بنائے جائیں اور چھت میں ہیرے جواہرات جڑے جائیں۔ یہ محل ایسا خوش نما ہو عالی جاہ کہ اگر پریوں کی ملکہ اسے

دیکھے تو حضور کی لونڈی بن کر اس میں رہنے کی خواہش کرے۔" اس طرح اور درباریوں نے بھی اپنی اپنی تجویز پیش کی کہ محل ضرور بنایا جائے اور بہت شاندار بنایا جائے۔

ظالم بادشاہ اس وقت ایسا خوش نظر آرہا تھا جیسے اس نے کوئی نیا ملک فتح کیا ہو۔ اس کے وزیر اور امیر خوشامد بھری آوازوں میں اس کی تعریفوں کے پل باندھ رہے تھے اور وہ محسوس کر رہا تھا کہ دنیا میں سب سے زیادہ شان اسی کی ہے۔

اسی حالت میں اس نے اپنا داہنا ہاتھ اونچا کیا۔ یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ سب خاموش ہو جائیں اور غور سے اس کی بات سنیں درباری ایک دم چپ ہو گئے اور خوف بھری نظروں سے بادشاہ کی طرف دیکھنے لگے، وہ حکم دینے کے انداز میں بولا "سب سن لیں، ہم چاہتے ہیں محل بنانے کا کام نہ صرف آج سے بلکہ اسی وقت سے شروع کر دیا جائے۔ منادی کرا دو۔ سب مزدور اور کسان اپنی کدالیں اور پھاوڑے لے کر آجائیں اور پہاڑ کی چوٹی تک پہنچنے کے لئے راستہ بنانے کا کام شروع کر دیں جو شخص ہمارا یہ حکم نہیں مانے گا اسے سخت سزا دی جائے گی۔

جس زمانے کی یہ کہانی ہے اس زمانے میں بادشاہ ایسے کاموں کی مزدوری نہیں دیا کرتے تھے۔ بس کام کرنے والوں کی روکھی سوکھی روٹی کا انتظام کر دیا کرتے تھے۔ اسے بیگار لینا کہا جاتا تھا اور یہ غریبوں کے ساتھ بہت بڑا ظلم تھا، امیروں اور وزیروں کے لئے یہ بات ضروری تھی کہ بادشاہ کو اس ظلم سے روکتے، لیکن انہوں نے اس کے اس حکم کی بھی خوب تعریف کی اور ذرا دیر بعد ہی شاہی ہرکارے ڈھول بجا بجا کر منادی کرنے لگے۔

"ملک خدا کا، حکم بادشاہ کا، جوان عمر کے سب کسانوں کو اور مزدوروں کو حکم دیا جاتا ہے کسیاں پھاوڑے اور کدالیں لے کر آجائیں اور پہاڑ کی چوٹی تک پہنچنے کے لے راستہ بنانے کا کام شروع کر دیں۔"

بادشاہ کے نجومیوں نے اسے بتایا اس برس خوب بارشیں ہوں گی کسانوں کے کھیتوں، کھلیانوں میں اناج کے ڈھیر لگ جائیں گے، لیکن بارش برسانے والے بادل تو ناراض ہو گئے تھے۔ بادلوں کے ٹکڑے ہوا پر تیرتے ہوئے آتے ضرور تھے لیکن برسے بغیر ادھر ادھر بکھر جاتے تھے۔ بارش کا پورا موسم اس طرح گزر گیا اور چند مہینوں ہی میں ملک کی یہ حالت ہو گئی کہ تالاب اور کنوئیں خشک ہو گئے۔ دریاؤں میں پانی کم ہو گیا۔ لوگ امید بھری نظروں سے بادلوں کو دیکھتے تھے اور جب وہ بن برسے پھٹ جاتے تھے تو مایوس ہو جاتے تھے۔ بڑے بوڑھے کہتے "لوگو، اللہ پاک سے اپنے گناہوں کی معافی مانگو۔ سچے دل سے توبہ کرو اور بارش کے لئے دعا مانگو۔ لگتا ہے ایسا قحط پڑے گا کہ چرند پرند تک مر جائیں گے۔"

اس قدرتی عذاب کے علاوہ غریبوں پر دوسرا عذاب بیگار کا تھا۔ بادشاہ کے سپاہی بھوکے پیاسے

مزدوروں اور کسانوں پر کوڑے برسا برسا کر راستہ بنانے کا کام کراتے تھے۔ ان مظلوموں کی فریاد سننے والا کوئی نہ تھا۔ بادشاہ اپنے محل کے خوب سجے ہوئے ٹھنڈے کمروں میں ناچ گانے کی محفلیں جماتا تھا اور خوشامدی امیروں، وزیروں کی باتیں سن سن کر خوش ہوتا رہتا تھا۔ اسے کچھ معلوم نہ تھا کہ غریب، رعایا کا کیا حال ہو گیا ہے۔

ایک دن ظالم بادشاہ ناچ، گانے کی محفل میں بیٹھا قہقہے لگا رہا تھا کہ اس کی چھوٹی بیٹی شہزادی نیلوفر اپنی دو تین سہیلیوں کے ہمراہ آ گئی۔ بادشاہ ان بچیوں کو دیکھ کر خوش ہو کے بولا۔ "ارے تم لوگ یہاں کیسے آ گئیں؟ کسی نے روکا نہیں تمہیں؟"

شہزادی بولی۔ "روکا تو تھا لیکن ہم رکے نہیں اس لئے کہ ہم اپنے ابا حضور سے ایک ضروری بات کہنا چاہتے تھے۔"

"تو پھر کہو" بادشاہ نے یہ کہہ کر بہت پیار سے شہزادی کو گود میں بٹھا لیا۔

"ہم یہ شکایت کرنے آئے ہیں ابا حضور، کہ شاہی باغ کے سارے پھول اور پودے مرجھا گئے ہیں اور وہ ہرنی مر گئی ہے جس کے بچوں کو ہم پیار کرتے تھے۔" شہزادی نے کہا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔

بادشاہ بہت اونچی آواز میں بولا۔ "یہ کیسے ہو سکتا ہے! وزیر اعظم، تم سن رہے ہو مابدولت کی پیاری بیٹی کیا کہہ رہی ہے؟"

وزیر اعظم اٹھ کھڑا ہو گیا اور سینے پر ہاتھ رکھ کر جھکتے ہوئے بولا۔ "شہزادی بالکل ٹھیک فرماتی ہیں عالی جاہ، نہ صرف شاہی باغ کے بلکہ پورے ملک کے باغوں کے پھول اور پودے مرجھا گئے ہیں، پچھلے کئی مہینوں سے دریاؤں کا پانی بھی کم ہو گیا ہے کیونکہ بارش نہیں برسی۔"

"لیکن کیوں نہیں برسی بارش؟ ہم کہتے ہیں فوراً تحقیق کرو اور ان لوگوں کو سخت سزا دو جن کی بے پروائی اور نالائقی کی وجہ سے بارش نہیں برسی۔" بادشاہ اس وقت گہرے نشے میں تھا۔ اس لئے اس نے بے عقلی کی یہ بات کہی۔

وزیر اعظم کو معلوم تھا کہ اگر اس نے اس وقت یہ کہا کہ بارش تو اللہ پاک کے حکم سے برستی ہے۔ کسی انسان میں یہ طاقت نہیں کہ بارش برسا سکے یا اسے روک سکے تو نشے میں ہونے کی وجہ سے یہ بات بادشاہ کی سمجھ میں نہیں آئے گی، چنانچہ بہت ادب سے بولا۔ "بہتر حضور والا، ایسا ہی ہو گا۔ یہ خادم ابھی ان لوگوں کو سزا دینے کا انتظام کرتا ہے۔"

"ہاں اسی وقت، فوراً۔" بادشاہ بہت غصے سے بولا۔ پھر شہزادی کو گود سے اتارتے ہوئے کہنے لگا "لو بیٹی اب تم جاؤ۔ ہم نے حکم دے دیا ہے شاہی باغ کے پھول بھی ٹھیک ہو جائیں گے اور ہرنی بھی زندہ ہو جائے گی۔"

سوکھے ہوئے پودوں کے سوکھے اور مرجھائے ہوئے پھول کس طرح تر و تازہ ہو سکتے تھے اور مری

ہوئی ہرنی کس طرح زندہ ہو سکتی تھی۔ وزیر اعظم نے بادشاہ کا حکم پورا کرنے کے لئے مالیوں کو بہت برا بھلا کہا اور مارا اور شاہی حکیموں کو بھی خوب ڈانٹا، لیکن اس بیوقوفی سے بھلا کیا ہو سکتا تھا۔ شہزادی یہ سارا تماشہ دیکھتی رہی اور جب باغ کے پھول ویسے ہی رہے تو رونے لگی اور بادشاہ کے پاس جانے کی کوشش کی، لیکن وزیر اعظم نے اسے دربار میں نہ جانے دیا۔ بہلا پھسلا کر جنگل کی طرف لے گیا۔ وہ جانتا تھا کہ اگر شہزادی نے پھر شکایت کی تو اس کی شامت آجائے گی۔

شاہی باغ کے درختوں اور پودوں کی طرح جنگل کے درخت اور جھاڑیاں بالکل ہی بے رونق نہ ہوئی تھیں، لیکن پھل اور پھول ان پر بھی نہ تھے بارش نہ ہونے کا اثر ان پر بھی پڑا تھا۔ وزیر اعظم نے شہزادی سے یہ کہا تھا کہ آپ کے لئے ہم نے ایک بہت بڑا باغ لگوایا ہے۔ آپ اس کی سیر کریں گی تو خوش ہو جائیں گی۔ اس کا خیال تھا کم عمر شہزادی بہلاوے میں آجائے گی، لیکن وہ فوراً سمجھ گئی کہ اسے دھوکہ دے کر جنگل میں لے آئے ہیں۔ غصے بھری آواز میں بولی "یہ باغ نہیں ہے۔ یہ تو جنگل ہے آپ ہمیں اس باغ کی سیر کرائیے جو ہمارے لئے لگوایا ہے۔"

وزیر اعظم نے اسے بہلانے کی بہت کوشش کی، لیکن وہ اپنی ضد پر اڑی رہی۔ لاڈلے بچوں کی ضد مشہور ہے، اور وہ تو لاڈلی شہزادی تھی۔ اس نے وزیر اعظم کو خوب ڈانٹا۔ وہ مچل گئی اور ایک سوکھی جھاڑی کے قریب زمین پر بیٹھ کر رونے لگی۔ وہ روتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ "ہم نہیں جانتے اس وقت ہماری ہرنی کو زندہ کیجئے اور ہمارے باغ میں پھول اُگائیے!"

بادل کا وہی ٹکڑا اس وقت بھی ہوا میں تیر رہا تھا۔ اس نے شہزادی کو روتے ہوئے دیکھا تو گرج کر بولا۔ "ہوں..... اب پتا چلا شہزادی صاحبہ، بڑا غرور تھا اپنی فوج اور پولیس پر، اگر طاقت ہے تو ننھا سا ایک پھول ہی کھلا دو، ایک تنکے کو ہی ہرا کر دو!"

بادل کے ٹکڑے کی یہ بات ہوا نے سنی تو نرمی سے بولی۔ "بادل بھائی، ننھی شہزادی سچ مچ بہت پریشان ہے۔ کم سے کم اس پر تو رحم کرو اور بارش برسا دو۔ بارش برسنے سے زمین پر پھر پھول کھلیں گے تو یہ خوش ہو جائے گی۔" "پہلے میں نے بارش برسانے سے روکا تھا، لیکن اب کہتی ہوں بارش برسا دو۔

"ہرگز نہیں، ہرگز نہیں، شہزادی بھی تو اسی ظالم بادشاہ کی بیٹی ہے جو اپنے آپ کو (نعوذ باللہ) خدا سمجھتا ہے۔ یہ روتی ہے تو روتی رہے۔" بادل اور بھی زور سے گرج کر بولا۔

ہوا پہلے تو نرمی سے بولی۔ "بادل بھائی، یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟ بچے چاہے کسی ظالم آدمی کے گھر ہی پیدا ہوئے ہوں؟..... بھولے بھالے اور بے گناہ ہوتے ہیں۔ یہ شہزادی بے شک ظالم بادشاہ کی

بیٹی ہے، لیکن یہ خود بہت نیک اور اچھی ہے۔ کیا تم یہ بات بھول گئے کہ اللہ پاک سب بچوں کو چاہے وہ گورے ہوں یا کالے، ان کے ماں باپ امیر ہوں یا غریب ایک سی حالت پر پیدا کرتا ہے۔ اور یہ حالت بہت اچھی ہوتی ہے۔ اللہ پاک ان سب سے پیار کرتا ہے۔ یہ تو ان کے ماں باپ ہوتے ہیں جو انہیں اچھا یا برا بنا دیتے ہیں۔ تم دیکھ نہیں رہے ننھی شہزادی کیسی نیک دل ہے؟ پھولوں کے مرجھا جانے اور ہرنی کے مرجانے کی وجہ سے یہ کس قدر اداس ہوگئی ہے۔ میں تم سے کہوں گی خدا کے لئے اس کے بارے میں کوئی غلط بات مت سوچو۔"

جب بادل اور ہوا یہ باتیں کر رہے تھے ننھی شہزادی آسمان کی طرف دیکھ کر اپنے ننھے ننھے ہاتھ اٹھا کر دعا مانگ رہی تھی۔ "اے میرے پیارے خدا، تو میری دنیا کو پہلے جیسا بنا دے۔ اس کے باغوں میں پھر پھول کھلا دے۔ مجھے پھول بہت اچھے لگتے ہیں۔ اے میرے اللہ، اب مجھے معلوم ہو گیا ہے کہ میرے ابا جان یا کوئی اور دنیا کو پہلے جیسا نہیں بنا سکتا۔ یہ طاقت تو صرف تجھ میں ہے۔ تو ہی سوکھے پودوں کو ہرا کر سکتا ہے اور تو ہی میری ہرنی میں جان ڈال سکتا ہے۔ اے میرے اللہ، ہم پر رحم کر دے، ہم پر رحم کر دے۔ پھولوں کے بغیر میں بہت اداس ہوں۔ میرا جی نہیں لگتا۔ میرا دل چاہتا ہے کہ خوب زور زور سے روؤں۔ خوب زور زور سے روؤں۔" اور یہ آخری بات کہتے ہوئے شہزادی سچ مچ رونے لگی۔ اس کی خوبصورت آنکھوں سے آنسو برسنے لگے۔

ہوا کی یہ بات سن کر بادل پہلے کی طرح گرج کر جواب دینا چاہتا تھا، لیکن وہ چپ رہا۔ اسے ہوا کی یہ بات ٹھیک ہی لگی کہ سب بچے گناہوں سے پاک اور معصوم ہوتے ہیں۔ اگر کسی کے ماں باپ اچھے نہ ہوں تو اس میں ان کا قصور نہیں ہوتا۔ اب وہ بہت غور سے شہزادی کی دعا سن رہا تھا۔ لگتا تھا دعا کے الفاظ اس پر اثر کر رہے ہیں۔

ہوا نے اس کی یہ بدلی ہوئی حالت دیکھی تو دھیرے سے بولی۔ "بادل بھیا، لو اب برس بھی پڑو۔ دیکھ نہیں رہے پیاری شہزادی کی آنکھوں سے آنسو برس رہے ہیں۔"

شہزادی کے آنسوؤں نے بادل پر بھی اثر کیا تھا۔ اس نے ہوا کے جواب میں کچھ کہنے کی جگہ ہلکی سی جھرجھری لی اور پیاسی زمین پر چھم چھم مینہ برسنے لگا۔ کسان اور ان کے بچے خوشی سے ناچتے ہوئے گھروں سے باہر نکل آئے اور آواز ملا کر اللہ کی تعریف کے گیت گانے لگے۔

کہتے ہیں جب دنیا میں کوئی مصیبت آتی ہے تو وہ کسی بچے کی دعا ہی سے دور ہوتی ہے۔

بوجھو تو جانیں

مرسلہ: عبداللہ خورشید احمد

۱ وہ کیا لفظ ہے تم جو دیکھو کہیں
تو لازم ہے تم کو وہ پڑھنا نہیں

۲ پہلے پاؤں سے اسے اٹھایا
پھر سر آنکھوں پہ بٹھایا

۳ اک گورے کو جب نہلایا
تڑپا، چیخا، شور مچایا

۴ ہاتھ تو ہم کانوں کو لگائیں
ہم وہی پھر کرتے جائیں

۵ سو رنگوں میں رنگی جائے
ایک بھی رنگ نہ چڑھنے پائے

۶ اک تلوار سی ہے دو دھاری
جس نے کاٹی کھیتی ساری

۷ پیڑ ہے وہ اک سیدھا سادا
ہے وہ پورا کہہ دیں آدھا

۸ باتوں باتوں میں وہ کھایا
کھاکر بھی ثابت ہی پایا

۹ گلا تو ہے سر ساتھ نہیں ہے
بازو ہیں کوئی ہاتھ نہیں ہے

۱۰ آپ نے ہاتھ میں اسے سنبھالا
اس نے آپ کو پیٹ میں ڈالا

۱۱ کوئی نہ دیکھے اور دکھلائے
لیکن وہ سب کو تڑپائے

۱۲ جب دیکھو پانی میں پڑا ہے
پانی بہتا ہے وہ کھڑا ہے

۱۳ دیکھ کر اس کا کمال اس کا ہنر
بادشاہوں کا بھی جھک جاتا ہے سر

۱۴ سب کے دستر خوان پر آئے
شاہ کے ساتھ بھی کھانا کھائے

۱۵ اوپر یا وہ نیچے جائے
قدم قدم پر جوتے کھائے

گزشتہ ماہ کی پہیلیوں کے درست جوابات

(۱) قرآن مجید (۲) ریڈیو (۳) چاند سورج (۴) فٹ بال (۵) نوٹ بک
(۶) سِل بٹا (۷) بم (۸) تختۂ سیاہ (۹) کدّوکش

قرعہ اندازی کے ذریعے انعامات حاصل کرنے والے دو خوش نصیب

(۱) غیور سبحان، حمید آباد (۲) سید عمران جیلانی، کراچی

بالکل صحیح جوابات ارسال کرنے والے ساتھیوں کے نام

کراچی سے : صائمہ وکیل، عمران ناصر، احمد رضا، کوکب خان، حنیف ابراہیم، نعمان احمد، صائمہ کلیم، اویس احمد، ثمینہ صدیقی، جویریا خورشید، اسامہ محمد شاہد، عامر سعید کیانی، منصور الحق کیانی، ندیم کیانی، رضوان کیانی، راشد کیانی، شاہد کیانی، النسرین بی بی، ممتاز الدین احمد، رعنا فیاض، افشاں عبدالغفور مٹھانی، طاہر صالح محمد مٹھانی، اسماعیل حمید بلوچ، سیدہ بینا اشرف، محمد اشرف گھانچی، سید نوید رفیق، حافظ سید یاسر حسین نقوی، عارف غلام، ملیحہ اختر، نعمان طارق سلیم، عدنان ادریس، ارشد حسین قائمی، صوفیہ بھٹی، امجد حسین قائمی، تابندہ جبیں قائمی، صائمہ گل، کنیز فاطمہ، خالدہ جبیں، فرحین عنایت شیخ، سائرہ عبدالغفور، شہزاد اکبر، قرۃ العین عبدالرشید، اسد اکبر، طیب شاہ، انعام اللہ انصاری، محمد طفیل، محمودہ کوثر، بینش رسول، سید عرفان جیلانی، شبانہ اختر، مہ پارہ اختر، سید آفتاب جیلانی، شبانہ ملک، صبا اختر، سید فیروز جیلانی، فرحین حق، فرحان الحق، محمد سہیل سلمان، نثار احمد ہاشمی، عشرت اقبال صدیقی، اویس، محمد فیصل رفیق، اسما بیگم، خالد حسین، نعمان خان، جمیل احمد انصاری، سید ثاقب اقبال، نعیمہ فرید انصاری، شازیہ خان، فوزیہ حنان، آسیہ خان، اوصاف علی، عمیر اقبال خان، نزہت فاطمہ، احمد حسین صدیقی، محمد مصباح الدین، غزالہ فرحت، عظمیٰ امجد، ام ایمن قطب الدین، مسرت جان رانی، اویس حسن شیخ، یوسف حسن شیخ، سید قیصر عباس، نزہت علی نواز جسکانی، فہد عمران، محمد فیاض حیدر، احسن علی نقوی، مہوش رسول، سید محمد تمیم، سارہ حفیظ ملک، محمد خالد حنان، محمد فیصل عزیز خان لشیروانی، نعمان احمد خان، محمد یونس فاروق، امبر حنا، عصمت، محمد جمیل انعام خان، محمد سلمان خان، محمد جاوید حسین، مصحف رسول، ارم حمید، شاہ رخ محمد، شاہ رخ احمد خان، سہیل احمد خان جدون، مصور ریاض، امبر جہاں عبداللہ خان، محمد کاشف انصاری، محمد صفوان موتی والا، خرم نور خان، شجاعت حسین شیخ، حفاظت علی خان، زیدی عبدالرشید، قرۃ العین ضیاء الدین، محمد علی صدیقی، زبیر متین، سیدہ صالحہ فاطمہ، محمد علی حنان، حشمت علی خان، عصمت علی حنان، عظمت علی خان، دانش علی حنان، ایچ اے خان، سیدہ طیبہ معراج، سیدہ رابعہ نقوی، سید عبداللہ واحد، سید عبدالرحمٰن نقوی، سید مطیع الرحمٰن، سیدہ عائشہ خلیل، سید حبیب اللہ انور، سید اویس اقبال، شازیہ ناد۔

حیدرآباد سے : محمد راشد، رفعت سبحان، سجاد احمد خان، نمرتا کماری، عبدالشریف، ضیاء عباس، محمد عارف ایاز، عدیل محمد خان، محمد ظفر صدیقی، عشرت لودھی، سیما عقیل راجپوت، شمیم عقیل راجپوت، خدیجہ عنایت علی خان، تسنیم عالم منظر، سید عرفان علی، محمد علی عرسانی۔

لاہور سے : سہیل اکبر خان، سید وقاص احمد، سہیل حنیف، روحی بانو، مہوش طالب، سلطانہ خلیل احمد، سائرہ مدثر، وجیہہ حیدر۔

شیراز محمود خاکوانی، بہاولپور ـ صبرینہ بتول، سیالکوٹ ـ خالد محمود خان، میخن آباد ـ علی رضا، سانگھڑ ـ محمد فہیم منصوری، سانگھڑ ـ حسن رضا، رباب محمود، اٹک ـ محمد تنویر، سیالکوٹ، وحید اختر، راولپنڈی ـ عمران نواز، ٹھیکریاں جہلم ـ محمد فاروق کمبوہ، محراب پور ـ صائمہ بشیر، اسلام آباد ـ محمد امجد ملک، ٹنڈو الہ یار ـ خلیل احمد تبسم، باغ و بہار ـ محمد ریحان، اسلام آباد ـ جویریا نورین، حاصل پور اولڈ ـ محمد علی بھٹی، سکرنڈ ـ ایم طاہر خان، (؟) ـ عالیہ نوید، پشاور ـ عدیل عمر بیگ، مرزا اسامہ بیگ، کمالیہ ـ عقیل احمد، پشاور ـ محمد سلمان رضا، ٹنڈو آدم ـ ثاقب طیب طاہر، صادق آباد، خواجہ نوید ظفر، راولپنڈی ـ سید ذیشان شاہ، احمد پور شرقیہ ـ رضوان غفور، حضرو ـ محمد عبداللہ، بہاولنگر ـ شکیل احمد خان، جہلم ـ سعدیہ رفیق ٹالوری، نواب شاہ ـ رابعہ ظفر، رحیم یار خان ـ محمد وسیم صادق، بہاولپور

سہیل خالد چیمہ، گنیانوالہ۔ عصمون صفدر، راولپنڈی۔ اکرم سلیمان، میرپورخاص۔ محمد سلیم ولی، ٹنڈوآدم۔ صدف مسعود، مظفرآباد آزاد کشمیر۔ شفیق احمد سرائے عالمگیر۔ عبدالسلام غوری، بھکر۔ ثوبیہ حسنین، فرخ حنین، رسالپور۔ محمد خرم قاضی، اسلام آباد۔ محمد خرم ہارون، لاڑکانہ۔ عبدالاحد قریشی، چترپڑی آزاد کشمیر۔ قمر زمان، فیصل زمان، وحید اختر، راولپنڈی۔ زاہد شمس، میرپورخاص۔ طیبہ ظہور، نوشہرہ ورکاں۔ راجہ اے حسین بھٹی، سکرنڈ۔ بشریٰ جبیں، حاصل پور۔ محمد احسان الرحمٰن، ڈی جی خان۔ نسیم احمد قائم خانی، پنوعاقل۔ روبینہ عبدالشکور، نواب شاہ۔ علی جبران ملک، مخدوم پور۔ عمرانہ نورین، پشاور۔ ناصر نذیر منہاس، گوجرخان۔ بینش ناز، پشاور۔ عامر آفتاب احمد، سرگودھا۔ راؤ شاہد اقبال بہادر، نواب شاہ۔ بابر کمال، راولپنڈی۔ مہ رخ حبیب، دھابے جی۔ شہریار علی صدیقی، کوئٹہ۔ عدنان عابد، ابوظہبی۔ وقاص بن انعام، جواد شفیق، فیصل آباد۔ غلام قادر خان، ٹیکسلا۔ ہارون منصور، گجرات۔ محمد افتخار، ٹنڈوآدم۔ سید ارتضیٰ امین کاظمی، حاصل پور رمنڈی۔ محمد کلیم ولی، ٹنڈوآدم۔ جواد محب، گوجرانوالہ۔

ایک غلطی کرنے والے ساتھیوں کے نام

کراچی سے: حناانور، فرح مراد، نعمان مراد، ندیم سکندر، منیر احمد اعوان، عثمان غنی آدم سومار، جاوید صالح محمد مٹھانی، عمر عالم خان، ظفر احمد، مہدی علی شاہ، اقبال احمد فاروقی، محمد شیراز، نجم الحسن، محمد امین، عمران بلوچ، محمد ارشاد، محمد رمضان، زرینہ بشیر، عنبرین گلزار علی، محمد احسن، رضوان، عائشہ، محمد شاکر، حافظ زبیر ظہیر احمد، فیضان سرور شیروانی، محمد یحییٰ، عدنان احمد صدیقی، اطہر علی ملک، سلمان فارسی، مشرف حسین، منیر عبدالشکور، عمران جمیل، حمیرہ طیبہ، عبدالصمد مالکانی، ارم بخاری، لبنیٰ محمد اسلام، اسماعیل عبدالرحمٰن، تبسم دانش، ممتاز جیلانی، محمد صابر، محمد پرویز، سیدہ حفصہ، محمد عارف خان، فائزہ۔

لاہور سے: صائمہ بٹ، صوفیہ خلیل، درخشاں اشرف، اسما سعید، حنا وحید، محمد خباب امین، محمد علی جواد، رابیل اختر، محمد فیاض، سعید انور، کاشف یاس، تابندہ ریاض۔

پنڈی/اسلام آباد سے: ساجد الرحمٰن ترابی، ثنا سحر، ذوالفقار احسن، محمد آصف محمود، مہوش رسول، سیما رسول، ریحان رسول، محمد اعجاز، سعدیہ مجید، ساجد انور، عامر شہزاد، عدیل حمید، نعمان احمد۔

حیدرآباد سے: شہریار احمد، وحید خان، روبینہ نقاش، نادیہ میمن، رضوان اللہ نوری، آفتاب احمد بھٹو، فوزیہ سیف الرحمٰن، محمد کامران خان، عبدالجبار شیخ منصوری، عنبرین محمد یاسین آرائیں، عظمیٰ ناز، محمد ناظم، زاہدہ مغل۔

کمالیہ: صائمہ رانی، ایاز محمود، مختار احمد عابد، غلام احمد ڈوگر، فیصل عمران، شہزاد محمود، عبیداللہ محسن، محمد شبیر صدیقی، نابغہ رانا، علی رضا خان، محمد ظفراللہ ضیا، مشتاق فیق، انجی حنا۔ ندیم، ماٹلی۔ رضوان حیدر، وریامال۔ خرم شہزاد، نوید شہزاد، خان پور۔ صبا جمیل، رحیم یارخان۔ فواد، افتخار بٹ، دہران سعودی عرب۔ حفیظ الرحمٰن صابر، ملاکنڈ ایجنسی۔ مختار احمد شیرازی، ٹنڈوآدم۔ محمد یامین سجاول۔ سید اصغر علی، شیخوپورہ۔ عامر شہزاد، فیصل آباد۔ جمیر اسلیم خان، جھنگ۔ مہدی حسن، ملتان۔ رانا اسد کلیم، فیصل آباد۔ خالد محمود فرخ، راجن پور۔ زاہدہ رحمت، ساہیوال۔ اشفاق حسین، نواب شاہ۔ نعیم طاہر، بھکر۔ قمرالاسلام، فیصل آباد۔ عامر بلال مغل، ڈی آئی خان۔ آمنہ بتول، کوہاٹ۔ زاہد منان قریشی، آزاد کشمیر۔ محمد معظم بابر، بہاولپور۔ میمونہ بی بی، ملتان۔ گل زرین مغل، ایبٹ آباد۔ ابوذر مرتضیٰ معاویہ فاروقی، میلسی۔ محمد نظام الدین، گوجرانوالہ۔ عرفان غوری، بھکر۔ قیصر محمود قیاسی، مانسہرہ۔ اشفاق احمد، سرائے عالمگیر۔ مصباح فلک بلوچ، ڈی جی خان۔ محمد شریف ظفر، قصور۔ اسکے علاوہ سیکڑوں خطوط ایسے بھی ہیں جن میں ایک سے زیادہ غلط جوابات دیئے گئے ہیں مگر جگہ کی کمی کے باعث ان ساتھیوں کے نام شائع نہیں ہوسکیں گے۔

انعامی مقابلہ "بوجھو تو جانیں" میں ہر ماہ قارئین کی بھیجی ہوئی پہیلیاں شائع ہوتی ہیں۔ پہیلیاں بھیجنے والے ساتھی کے لئے ایک عدد ڈیجیٹل گھڑی تحفتاً اور دو عدد ڈیجیٹل گھڑیاں دو خوش نصیب ساتھیوں کو بذریعہ قرعہ اندازی انعام کے طور پر دی جاتی ہیں۔ مقابلہ میں شرکت کی شرائط مندرجہ ذیل ہیں۔

جوابات الگ کاغذ پر، الگ لفافے میں، صاف، واضح اور خوش خط لکھے ہوئے ہوں۔ ہر ماہ کی ۱۲ تاریخ تک ہمیں موصول ہوجائیں۔

بھیجنے والے کا مکمل پتہ ضرور تحریر ہو۔ تاخیر اور مکمل پتہ نہ ہونے کی صورت میں جوابات کو مقابلے میں شامل نہیں کیا جائے گا۔

ہمارا پتہ ہے: انچارج انعامی مقابلہ "بوجھو تو جانیں" ماہنامہ آنکھ مچولی۔ ۱۔ پی آئی بی کالونی، کراچی۔ ۷۴۸۰۰

دو دوست

مجاہد حسین باسط

تھے جنگل میں دو دوست محوِ سفر
چلے جارہے تھے بلا خوف و ڈر

اچانک انہیں ریچھ آیا نظر
وہ گھبرا اٹھے ریچھ کو دیکھ کر

مددگار کوئی نہ تھا سامنے
وہ دونوں لگے خوف سے کانپنے

جو تھا بے وفا، پیڑ پر چڑھ گیا
خیال اپنے ساتھی کا کچھ نہ کیا

چلا آیا یوں ریچھ اُن کی طرف
سپاہی ہو جیسے وہ خنجر بکف

زمین پر تھا اک دوست بے آسرا
وہ روکے ہوئے سانس لیٹا رہا

قریب آ کے سونگھا اسے ریچھ نے
فقط لاش سمجھا اسے ریچھ نے

گیا ریچھ اس کو جوں ہی چھوڑ کر
اتر آیا نیچے، جو تھا پیڑ پر

سوال اس سے آکر وہ کرنے لگا
تیرے کان میں ریچھ نے کیا کہا

وہ بولا نصیحت مجھے اس نے کی
جو کام آئے تیرے، ہے ساتھی وہی

ہم موت سے نہیں ڈرتے

ریاض عالم

صبح ہو چکی تھی مگر ہر طرف ہو کا عالم تھا، نہ پرندوں کی چہچہاہٹ نہ انسانوں کی آوازیں، کیونکہ گزشتہ دو ہفتے سے وہاں کرفیو نافذ تھا۔ یہ کشمیر کا شہر بارہ مولا ہے جہاں کے ہر فرد کے دل سے ایک ہی نعرہ نکل رہا ہے کہ "کشمیر بنے گا پاکستان"، "کشمیر بنے گا پاکستان۔" یہیں ایک کچے گھر میں ایک تنظیم "الجہاد" کا سرگرم رکن محمود اپنی بہن سبین اور چھوٹے بھائی ثابت کے ساتھ رہتا تھا۔

یہ کچھ دن پہلے کا واقعہ تھا کہ محمود اور اس کے ساتھیوں کو پتہ چلا کہ سرینگر سے بڑی تعداد میں اسلحہ بارہ مولا پہنچایا جائے گا جو کہ آپریشن "تھری اسٹار" میں استعمال کیا جائے گا اور اس آپریشن کے بعد بارہ مولا اور "ہڑپہ" میں کوئی فرق باقی نہیں رہے گا۔ اس لئے محمود نے اپنے ساتھیوں سے کہا "جس سڑک سے اسلحہ سے بھرے ہوئے ٹرک بارہ مولا میں داخل ہوں گے، ہم اس سڑک کے ساتھ واقع پہاڑی

پر مورچہ بنالیں گے اور جب ٹرک مقررہ سڑک سے گزریں گے تو ہم اس اسلحہ کو استعمال سے پہلے ہی ناکارہ بنا دیں گے۔"

چنانچہ مجاہدین مقررہ وقت پر اپنی جگہ پر موجود تھے اور جب ٹرک آئے تو انہوں نے اپنی مشین گنوں کے منہ کھول دیئے جس سے چند ہی منٹوں میں ٹرکوں کا نام و نشان تک مٹ گیا مگر ایک فوجی جو کہ فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا تھا، اس نے محمود کو دیکھ لیا تھا اور اس واقعہ کے چند روز بعد ہی محمود کے گھر پر حملہ کر دیا گیا۔ اتفاق اس وقت محمود گھر میں موجود نہیں تھا، ثلبت تو جلدی سے صندوق میں چھپ گیا البتہ اس کی باجی کو فوجی پکڑ کر لے گئے۔ محمود اور ثلبت نے بہت ڈھونڈا مگر کوئی سراغ نہ مل سکا۔

ایک دن محمود گھر سے باہر تھا۔ ثلبت ریڈیو پاکستان سن رہا تھا کہ اچانک خبر آئی کہ دریائے جہلم جو کہ کشمیر سے پاکستان میں داخل ہوتا ہے، اس سے ایک عورت کی مسخ شدہ لاش ملی ہے جس کے گلے میں پڑے لاکٹ پر "سبین خان، بارہ مولا" درج ہے۔ یہ سنتے ہی ثلبت سکتے میں آ گیا۔ جب اس کو ہوش آیا تو وہ سیدھا تہہ خانے میں رکھے صندوق کی طرف بھاگا جس میں اس کے بھائی محمود نے قسم قسم کا اسلحہ جمع کر رکھا تھا اس نے فوراً ایک ریموٹ کنٹرول بم اٹھایا، اسے تھیلے میں ڈالا اور وہ خصوصی پاس جو محمود نے ایک انڈین سیکرٹ ایجنٹ کو قتل کر کے حاصل کیا تھا، اپنی جیب میں رکھا اور ملٹری ہیڈ کوارٹر کی جانب چل پڑا۔

اب وہ بھارتی انٹیلی جنس کے سب سے قابل اور خطرناک افسر موتی لعل کو ٹھکانے لگانے کا عہد کر چکا تھا۔ چاروں طرف کرفیو لگا ہوا تھا مگر پاس کی بدولت اسے کوئی دشواری نہیں ہوئی اس کے علاوہ کوئلے کی مونچھوں نے بھی اس کا کام آسان کر دیا۔ گیٹ پر پہنچ کر اس نے کہا کہ "مجھے گورنر سکسینہ نے بھیجا ہے اور میں انڈین سیکرٹ ایجنٹ ہوں اور میں کرنل موتی لعل کے لئے ایک سیکرٹ پیغام لے کر آیا ہوں، یہ کہہ کہ اس نے پاس فوجیوں کو دکھایا۔ جب فوجیوں نے اسے بتایا کہ کرنل صاحب ایک اسپیشل میٹنگ میں ہیں تو اس نے کہا کہ یہ پیغام میٹنگ سے زیادہ ضروری ہے۔ بالآخر اسے اندر جانے کی اجازت مل ہی گئی۔ جب وہ میٹنگ روم کی طرف جا رہا تھا تو اسے خیال آیا کہ اس نے اس بم کا ریموٹ تو اٹھایا ہی نہیں اور بٹن سے بم چلانے کی صورت میں وہ خود بھی مر سکتا ہے مگر ایک دم اس کے ذہن میں ایک خیال آیا اور وہ پرسکون ہو گیا۔ میٹنگ روم میں پہنچ کر اس نے تھیلا میز پر رکھا اور سلام کرنے کے بہانے جھک کر بٹن دبا دیا۔ موتی لعل اور اعلیٰ افسران کے جسموں کے پرخچے اڑ گئے اور ..... اور ثلبت کا خون شہیدوں کے لہو میں شامل ہو گیا۔

سیارے!

ایک دوسرے سے مختلف کیوں نظر آتے ہیں؟

نگہت آرا چوہان

سیاروں کے ایک دوسرے سے مختلف نظر آنے کی وجہ یہ ہے کہ یہ تمام سیارے مختلف مادوں سے بنے ہوئے ہیں۔ اگرچہ تمام سیارے سورج اور جزوی طور پر نظامِ شمسی کے گرد گھومتے ہیں۔ اس کے باوجود ان کی بناوٹ میں اختلاف ہے۔ دراصل ہمیں یہ بات بہت کم معلوم ہے کہ سیارے کس مادے سے بنے ہوئے ہیں۔ اس سوال کا جواب زمانۂ حال کی جاری تحقیقات اور مستقبل کے تحقیقاتی..... منصوبوں کے ذریعے خلا کی چھان بین کرنے کے بعد ہی دیا جاسکے گا۔ اب ہم ہر ایک سیارے کا علیحدہ علیحدہ جائزہ لیتے ہیں اور معلوم کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ

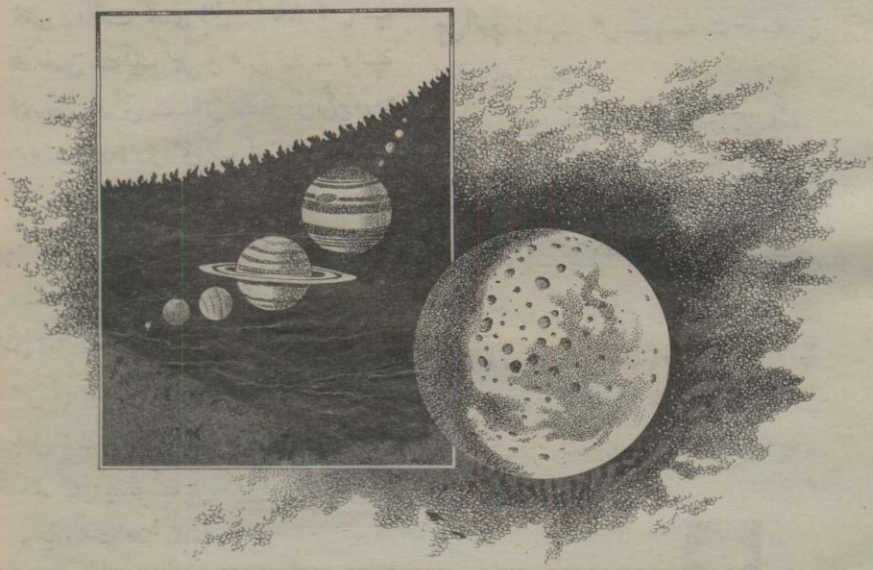

اب تک ان کی بناوٹ کے متعلق کیا معلومات حاصل ہوئی ہیں۔

۱۔ "عطارد" یہ ایک چھوٹا سا سیارہ ہے جس کا بیشتر حصہ چٹانوں پر مشتمل ہے اس کی سطح کے بعض حصے سیاہ ہیں اور اس پر بہت سے آتش فشاؤں کے دہانے پائے جاتے ہیں لیکن اس پر کوئی فضا یا کسی بھی قسم کا پانی موجود نہیں ہے۔

۲۔ "زہرہ" یہ ایک سفید گلوب کی مانند ہے جس میں دھندلے نشانات نظر آتے ہیں۔ یہ مکمل طور پر سفید بادلوں کی تہ میں چھپا ہوا ہے۔ یہ بادل پانی کے بخارات سے نہیں بلکہ جمے ہوئے گندھک کے تیزابی ترشے سے بنے ہوئے ہیں۔ زہرہ کے ان بادلوں کے نیچے جو فضا پائی جاتی ہے اس میں نا قابلِ برداشت کاربن ڈائی آکسائڈ گیس ہے جو سورج سے ایک کمبل کی طرح حرارت کو اپنے اندر جذب کر لیتی ہے۔ اس لئے زہرہ کی سطح پر درجۂ حرارت ۵۰۰ ڈگری سنٹی گریڈ تک پہنچ جاتا ہے۔ اس سیارے کی سطح پر بمشکل ہی پانی ہو گا۔

۳۔ "مریخ" اس کے صحرا چونکہ سرخ ہیں، اس لئے یہ سرخ سیارے کے نام سے مشہور ہے۔ اس کی جسامت ہماری زمین کے نصف کے برابر ہے۔ اس کی فضا میں ہلکے کاربن ڈائی آکسائڈ کے بادل پائے جاتے ہیں۔ مریخ پر زندگی کے حتمی آثار نہیں پائے گئے ہیں جس کی وجہ یہ ہے کہ یہ سیارہ بہت ٹھنڈا ہے۔

۴۔ "مشتری" زرد رنگ کا ایک گلوب سا نظر آتا ہے جس پر رنگین بادلوں کی ٹکڑیاں اِدھر اُدھر چکر کھاتی رہتی ہیں۔ اس کے بادلوں میں ایک بڑا سرخ دھبہ صاف نظر آتا ہے۔ یہ سیاہ ہائیڈروجن اور ہیلیم کا ایک بہت بڑا گولہ ہے جو سیارے کے مرکز کی طرف زیادہ سے زیادہ گھنا ہوتا چلا جاتا ہے۔

۵۔ "زحل" اس کا زیادہ تر حصہ سیال ہائیڈروجن پر مشتمل ہے۔ اس کے ارد گرد روشنی کا ایک چمکدار ہالہ نظر آتا ہے جو بے شمار چھوٹے چھوٹے ذرات سے بنا ہے جو اس سیارے کے ارد گرد چھوٹے چھوٹے چاندوں کی صورت میں گردش کرتے رہتے ہیں۔

۶۔ "یورینس" اس کے گرد بھی کئی ہالے یا رنگ ہیں اگرچہ یہ ہالے زحل کے ہالے کے مقابلے میں بہت زیادہ تاریک ہیں۔

۷۔ "نیپچون" ایک ہلکے سبز رنگ کی چیز ہے۔

۸۔ "پلوٹو" نظامِ شمسی کا سب سے چھوٹا سیارہ ہے بلکہ یہ ہمارے چاند سے بھی چھوٹا ہے۔ اس کا مدار اتنا مرکز گریز ہے کہ یہ بعض اوقات نیپچون سے بھی زیادہ سورج کے نزدیک آ جاتا ہے۔ مصنوعی سیاروں کی مدد سے خلا کی چھان بین کے ذریعے سائنس دان اس قابل ہو گئے ہیں کہ وہ نظامِ شمسی میں شامل دوسرے سیاروں کے متعلق بھی معلومات حاصل کر سکیں۔

بہ خدمت جناب

راحت صلاح الدین، کراچی ــــ نومبر کا آنکھ مچولی پڑھ کر بہت صدمہ ہوا۔ مجھے افسوس ہوا کہ میرے خط سے ایک خاندان کے افراد کو تکلیف پہنچی۔ میں نے اسما پاشا کے گھر والوں کو ایک تعزیتی خط لکھ دیا ہے۔ اللہ تبارک تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ اسما پاشا کو جنت الفردوس میں جگہ عطا کرے (آمین) آگے میں کیا لکھوں، میری کچھ سمجھ میں نہیں آرہا ہے۔ **محمد ایوب منظر، لاہور** ــــ نومبر کا سرورق بہت پسند آیا..... شاعر مشرق کے حوالے سے باتیں بھی پسند آئیں۔ "آگ کے سمندر میں چھلانگ" "جگ مگ کرتی مچھلیاں" اور "عالمی فٹ بال ٹرافی" کی چوری کی روداد پڑھ کر حیرت زدہ رہ گیا۔ **صائمہ گل اعوان، سعید آباد** ــــ پچھلے مہینے آپ نے ہمیں مشورہ دیا کہ وزیراعظم محمد نواز شریف کو خط لکھیں اور توجہ دلائیں کہ پرائمری تعلیم مفت اور لازمی قرار دی جائے لیکن آپ نے ان کا پتا نہیں لکھا۔ ہم اتنے چھوٹے ہیں ہمارے ذہن میں اتنے بڑے وزیراعظم کا پتا کیسے آسکتا ہے؟ ○ ..... وزیراعظم کو آپ وزیراعظم سیکرٹریٹ، اسلام آباد کے پتے پر خط لکھ سکتی ہیں۔ **وحید عامر، بوریوالہ** ــــ نومبر کے اداریے نے بہت متاثر کیا۔ جہاں تک میرا خیال ہے کہ اداریہ رسالے کی جان ہوتا ہے۔ آپ جیسا اداریہ کسی رسالے کا نہیں ہوتا۔ "جہنم میں چھلانگ" اور بریٹل اسٹار کی تصاویر دیکھ کر حیران رہ گیا۔ کہانی "ایڈیٹر کی میز پر" پڑھ کر یقین نہ آیا کہ یہ تحریر آنکھ مچولی جیسے معیاری رسالے میں شائع ہوئی ہے۔ **طارق محبوب میمن، کیڈٹ کالج پٹارو سندھ** ــــ نومبر کا سرورق بہت اچھا لگا۔ کہانیوں میں "مداوا"، "ایڈیٹر کی میز پر" اور مضمون بریٹل اسٹار پسند آیا۔ **فرمان علی، ملتان** ــــ آنکھ مچولی اچھا رسالہ ہے جو ہر ماہ قوم کے نونہالوں کو اچھی اچھی تعلیم ثقافتی، ادبی، اخلاقی اور علمی معلومات فراہم کرتا ہے

مدیر ماہنامہ آنکھ مچولی!

السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ

ایک دکھ بھری خبر کے ساتھ حاضر ہورہا ہوں۔ اکتوبر کا آنکھ مچولی دیکھا۔ اس میں ان افراد کے نام تھے۔ جن کے پتے آپ کو تحریروں کے معاوضے بھجوانے کے لئے مطلوب تھے۔ ان میں ایک نام مجاہد حسین باسط کا تھا۔ افسوس ہمارے یہ عظیم اور باصلاحیت بھائی اس دنیا میں نہیں رہے۔ گزشتہ دنوں اگست میں ان کا ایک ایکسیڈنٹ میں انتقال ہو گیا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔

مجلد بھائی کے والد صاحب ان کے بچپن ہی میں فوت ہو گئے تھے۔ آج کل مجلد بھائی بی اے کر رہے تھے اور ساتھ ساتھ اوکاڑہ کے ایک پرائیویٹ کالج میں ملازمت بھی اختیار کر رکھی تھی۔ انہیں شعر و شاعری سے گہری دلچسپی تھی۔ مرحوم، نیک بنو نیکی پھیلاؤ کے مشن پر بچپن ہی سے کاربند تھے اور تادم آخر اپنی اور طلبہ کی اصلاح میں مشغول رہے۔ ان کی والدہ ایک عظیم خاتون ہیں۔ وہ گھروں میں برتن دھو کر اپنے بیٹے کو اس مقام پر لائیں۔ افسوس مجاہد بھائی کی وفات کے بعد اس خاتون کا سوائے اللہ کے کوئی سہارا باقی نہیں بچا جبکہ مجلد شہید کی چھوٹی بہن کا بوجھ اب انہی ضعیف اور ناتواں کندھوں ہی پر ہے۔ اوکاڑہ کے، آنکھ مچولی کے کسی صاحب درد قاری نے شاید آپ کو ان کا پتا بھجوا دیا ہو۔ میں نے سوچا اگر کسی نے نہ بھیجا تو ہم سب قیامت کے روز کیا جواب دیں گے؟ ان کا پتا بھیج رہا ہوں۔ براہِ کرم ایک عظیم نوجوان کا اپنی عظیم ماں کے نام آخری تحفہ جلد از جلد بھجوایئے۔

والدہ محترمہ، مجاہد حسین باسط شہید گلی نمبر ۷ مکان نمبر ۱۱۳۔ حسین کالونی۔ اوکاڑہ

اللہ تعالیٰ ہمیں نیکی اور بھلائی کے کاموں میں ایک دوسرے کا معاون بنائے رکھے (آمین)

والسلام اللہ داد نظامی، ضلع وہاڑی

○ ..... ابھی ننھی اسما پاشا کا غم تازہ تھا کہ مجاہد حسین باسط کے انتقال کی خبر آپہنچی۔ مجاہد حسین کی ایک تحریر کشمیر نمبر میں شائع ہوئی تھی اور ایک نظم اس شمارے میں شامل ہے۔ وہ آنکھ مچولی کے بہت پرانے ساتھی تھے۔ خدا انہیں اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے (آمین) ہم سب کا فرض ہے کہ ان کی والدہ کی دلجوئی کے لئے انہیں خط لکھیں۔

فیاض احمد انیس، میاں چنوں — یہ جان کر خوشی ہوئی کہ آپ "ایجادات نمبر" نکال رہے ہیں۔ اس سائنسی دور میں ہمیں یہ جاننے کی اشد ضرورت ہے کہ کون سی چیز کب ایجاد ہوئی۔ **سائرہ مدثر۔ لاہور** — نومبر کا شمارہ بہت پسند آیا "بوجھو تو جانیں" بالکل اچھا نہیں۔ آپ اسے بند کر دیں۔ ○ ..... "بوجھو تو جانیں" پڑھنے والوں میں بہت مقبول ہے اس کی ڈاک سب سے زیادہ آتی ہے۔ **وسیم اختر، لاہور** — ○ ..... بچپن کے ساتھی میں لڑکیوں کو بھی موقع فراہم کریں تاکہ ہم بھی اپنی قلمی سہیلیاں بنا سکیں۔ ○ ..... بچپن کے ساتھی، میں ہم پالیسی کے تحت آپ لوگوں کی تصویریں اور نام شائع نہیں کرتے۔ امید ہے آپ اس مصلحت کو سمجھتی ہوں گی۔ **محمد آصف محمود، راولپنڈی** — نومبر کے شمارے میں "ماہ رواں کی پہلی بات" "عجیب سودا" "بری لڑکی" "سیلاب" "ایڈیٹر کی میز پر" اور "بخدمت جناب" "کرشمہ" اور نظم "غریب لڑکا" پسند آئی۔ "دماغ لڑایئے" میں پانچویں سوال کا جواب الٹ کر لکھ دیا گیا تھا۔ **نائلہ بختیار، کوہاٹ** — آج مجھے آپ کا گھڑی کا تحفہ ملا تو خوشی ہوئی۔

مجھے کیلکولیٹر والی گھڑی ملی ہے اور چونکہ میں سائنس کی طالبہ ہوں، اس لئے مجھے اس کا بے حد فائدہ ہو گا۔ **خالدہ جبیں (؟)** ___ اسما پاشا کی نانی کا خط پڑھا۔ اس خط کو پڑھ کر دل کو انتہائی رنج و ملال ہوا۔ اللہ تعالیٰ اسما کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔ اسما پاشا کے غم میں ہم سب قارئین برابر کے شریک ہیں۔ **محمد احسان الرحمٰن، ڈیرہ غازی خان** ___ "ایجادات نمبر" کی اشاعت بہت اچھا قدم ہو گا۔ اس نمبر کے ساتھ اگر آپ کوئی سائنسی انداز کا تحفہ دیں تو بہت اچھا ہو گا۔ مثلاً پاکٹ کوئز کی طرز کا سائنس کوئز وغیرہ۔ **سیدہ ناصرہ نقوی، کراچی** ___ آنکھ مچولی کے پچھلے سارے شمارے میرے پاس محفوظ ہیں۔ اس کے معلوماتی سلسلوں کو آگے بھی بڑھاتی ہوں۔ میں ان کی معلومات کو اپنی طالبات کو سناتی ہوں اور پھر ان سے سوالات کرتی ہوں اور یوں یہ سلسلہ پڑھائی کے ساتھ آگے بڑھ رہا ہے۔ **سیما محمود۔ ڈیرہ غازی خان** ___ میں اسکول میں آنکھ مچولی کا تذکرہ بہت فخر سے کرتی ہوں۔ اب تو میری کلاس کی لڑکیوں نے بھی آنکھ مچولی لینا شروع کر دیا ہے۔ **لبنیٰ سرفراز، سرگودھا** ___ پچھلے کسی شمارے میں ایک کشمیری بھائی محمد محسن اعظم نے نیلو فراماں کے لئے لکھا ہے کہ آپ کون ہوتی ہیں کشمیر کو پاکستان کا پانچواں صوبہ کہنے والی تو جناب محمد محسن اعظم صاحب آپ تو ایسے لڑ رہے ہیں جیسے آپ کی غلامی کے ذمہ دار پاکستانی ہیں۔ ہمیں کشمیر اور کشمیریوں سے اتنی ہی محبت ہے جتنی کہ اپنے بھائیوں اور بہنوں سے **محمد نذیر خطاط، ضلع سوات** ___ اس بار میرے ایک دوست جمیل نے مجھ سے "آنکھ مچولی" کی ایسی تعریف کی کہ میں نے اکتوبر کا شمارہ خرید ہی لیا اور رسالے میں ایسی انفرادیت پائی جو دوسرے رسالوں میں نہیں ملتی۔ یہ رسالہ جدید دور کی بے شمار معلومات فراہم کرتا ہے۔ **روبینہ نقاش (؟)** ___ میں آنکھ مچولی وڈیو میگزین خریدنا چاہتی ہوں۔ کیا میں وڈیو آپ سے منگواؤں یا نیوز ایجنسی سے لوں۔ آپ سے منگوانے کا کیا طریقہ ہے؟ ○ ... آپ اپنا پتا ارسال فرما دیں۔ "وڈیو میگزین وی پی کر دیا جائے گا آپ ڈیڑھ سو روپے دے کر چھڑا لیجئے گا"

عروج عائشہ، کراچی ___ نومبر کی تمام کہانیاں اچھی اور معیاری تھیں۔ مگر قلم قبیلے میں "چورمینا" پڑھ کر افسوس ہوا۔ کیا آنکھ مچولی جیسے رسالے میں بھی نقل شدہ کہانی چھپ سکتی ہے؟ ○..... ہر کہانی کے بارے میں پہلے سے یہ معلوم کرنا بہت مشکل ہے کہ یہ کہانی نقل شدہ ہے یا نہیں۔ **محمد شفیق شان، ضلع وہاڑی،** ___ براہِ کرم رسالے میں دو ایک صفحات قابلِ اشاعت اور ناقابلِ اشاعت تحریروں کے لئے وقف کر دیجئے اس طرح تحریریں بھیجنے والوں کی پریشانی کم ہو جائے گی۔ ○..... جی ہاں، ہم بھی اس پر غور کر رہے ہیں۔ انشاللہ ایسا ہی کیا جائے گا۔ **فہمینہ برڑو، مکلی سندھ** ___ "بخدمت جناب" میں اسما کرن چوہدری نے نارووال سے خط لکھا کہ وہ نو سال سے آنکھ مچولی پڑھ رہی ہیں۔ حالانکہ ابھی آنکھ مچولی کو نکلے ہوئے صرف چھ سال ہوئے ہیں۔ کشمیری بھائی عجیب قسم کے خط لکھتے ہیں۔ ہماری محبت کے جواب میں ان کی طرف سے تلخی کیوں؟ ○..... اسما کرن چوہدری اگر چھ سال سے رسالہ پڑھ رہی ہیں تو تین سال کا حساب کتاب آگے پیچھے ہو سکتا ہے انہیں اتنی رعایت ملنی چاہئے۔ **محمد آصف حسین، کراچی** ___ آپ کا بھیجا ہوا "بوجھو تو جانیں" کا انعام مجھے مل گیا۔ گھڑی بہت پسند آئی۔ شکریہ۔ **چوہدری افتخار احمد خضر، جھنگ** ___ سب سے پہلے آپ کا شکریہ ادا کروں گا کہ آپ نے لاہور میں پروقار تقریب رکھی جس میں ٹیلی وژن کا قیمتی تحفہ مجھے دیا گیا۔ تمام اہلِ علاقہ آکر مجھے مبارک بادیں دے رہے ہیں اور آنکھ مچولی کی بہت تعریف کر رہے ہیں کہ اس نے اتنا بڑا تحفہ دیا۔ **ریحان**

رسول، راولپنڈی ــــ کہانی بھیجنے کے لئے سادہ کاغذ استعمال کرنا چاہئے یا لائنوں والا۔ ○ ..... اس کی کوئی پابندی نہیں ہے۔ یہ خیال رہے کہ جو بھی لکھا جائے صاف ستھرا ہو اور آسانی سے پڑھا جا سکے۔ **سیما عقیل الرحمٰن، حیدر آباد** ــــ آنکھ مچولی میں تعریفی خطوط زیادہ شائع ہوتے ہیں اور تنقیدی خطوط آٹے میں نمک کے برابر ہیں۔ آنکھ مچولی تنقیدی خطوط سے ڈرتا کیوں ہے؟ بچوں کے جتنے رسالے شائع ہوتے ہیں ان میں تنقیدی خطوط کی جگہ کوئی خاص نہیں ہے۔ ہم جیسے بچے تنقیدی خطوط لکھتے ہوئے اس لئے ڈرتے ہیں کہ کہیں ہمارا نام نوٹ کر کے ہماری کوئی تحریر شائع نہ کی جائے۔ میں چاہتی ہوں کہ آنکھ مچولی کا دل اور رسالوں سے زیادہ بڑا ہو۔ ○ ..... آنکھ مچولی نے تنقیدی خطوط کی ہمیشہ حوصلہ افزائی کی ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ ایک رسالہ اسی وقت ترقی کر سکتا ہے جب پڑھنے والوں کے مشوروں کی روشنی میں اسے بہتر سے بہتر بنایا جائے۔ اسی لئے ان صفحات پر تنقیدی خطوط بھی شائع کیے جاتے ہیں لیکن آپ ہی بتائیے اگر ہمیں زیادہ تر تعریفی خطوط ملیں تو کیا ہم تنقیدی خطوط خود لکھ کر شائع کیا کریں۔ تنقید سے رسالے کو فائدہ پہنچتا ہے اس لئے تنقید کرنے والوں کو نقصان پہنچنے کا کوئی سوال ہی نہیں ہے۔ **مختار احمد۔ پشاور** ــــ ثونیہ افضل طور صاحبہ کا خط چھپا ہے کہ وہ چوتھی جماعت سے آنکھ مچولی پڑھ رہی ہیں اور اب تھرڈ ائیر میں پہنچ چکی ہیں۔ جناب یہ تو دس سال کا عرصہ ہوا جبکہ آنکھ مچولی کو نکلے ہوئے ابھی سات سال بھی پورے نہیں ہوئے۔ آپ ثونیہ افضل صاحبہ کے لئے دس سال پہلے سے آنکھ مچولی خصوصی طور پر چھپواتے رہے ہیں؟ ○ ..... بھئی آپ لوگوں نے تو ان کی بات پکڑ ہی لی۔ رسالے کی محبت میں اگر چند سال کی غلطی ہو جائے تو اسے نظر انداز کر دینا چاہئے۔ **سیّد اوصاف علی عابدی، ملتان** ــــ میں نے آپ کو دو کہانیاں "قاتل" اور "وقت" باری باری بھیجیں لیکن آپ نے شائع نہیں کیں..... پھر کمپیوٹر پر مضمون بھیجا۔ لیکن ابھی تک جواب موصول نہیں ہوا۔ ○ ..... کمپیوٹر پر مضمون ایجادات نمبر کے لئے ہے اور کہانیوں پر ابھی آپ کو مزید محنت کی ضرورت ہے۔ **محمد شاہد عبدالغفور۔ میر پور خاص** ــــ رسالہ دیکھ کر میری خوشی کی انتہا نہ رہی۔ کیونکہ آپ نے میری پہلی کہانی اپنے رسالے میں شائع کی..... سچی بات تو یہ ہے کہ آپ نئے لکھنے والوں کی بڑی حوصلہ افزائی کرتے ہیں ..... **سیما صدیقی، کراچی** ــــ نومبر کا شمارہ کہانیوں کی مقدار کے لحاظ سے بھرپور تھا۔ محمد عمر احمد خان کی تحریر "سیلاب" منیر احمد راشد کی "ابو نہیں سمجھتے" اور عبدالقادر صاحب کی نظم "سونے کی رینٹیں" کو شمارے کا حاصل کہا جائے تو بے جا نہ ہو گا۔ اس ماہ رنگین تصویروں کا انتخاب بہت خوب تھا۔ آنکھ مچولی کے آرٹسٹ صاحب اسکیچز بہت عمدہ بناتے ہیں۔ بہت تلاش کے بعد بھی اسکیچ کی کسی لکیر میں ان کا نام نہیں ملا۔ ○ ..... ہمارے آرٹسٹ صاحب کا نام مومن رحیم ہے۔ وہ نام سے زیادہ کام کے قائل ہیں۔ اور کام بھی بہت اطمینان سے کرتے ہیں۔ **آصف خان، کراچی** ــــ میں ظفر محمود شیخ صاحب کو سلام کرتا ہوں کہ انھوں نے ملکِ رواں کی پہلی بات میں نوجوانوں کی اصلاح بہت اچھے طریقے سے کی ہے۔ بے شک ہماری نئی نسل بہت بگڑ رہی ہے اور اگر انہیں اس وقت نہ روکا گیا تو ان کو آخر میں سنبھالنا ناممکن ہو جائے گا۔ **محمد عتیق عمر حسین، حیدر آباد** ــــ انکل! کیا آپ قلم قتلے، میں لکھنے والوں کو بھی معاوضہ دیتے ہیں؟ ○ ..... نہیں بیٹے! اس حصے میں ہم تحریریں حوصلہ افزائی کے لئے چھاپتے ہیں اور تحریر کا چھپنا ہی معاوضہ ہوتا ہے۔

میمی کو دادا مل گئے

ترجمہ و تلخیص:۔ محمد عمر احمد خان

میرا نام میمی ہے۔ میری عمر آٹھ سال ہے جب کہ میری سہیلی رابرٹا کارلسن نو سال کی ہے۔ ہم دونوں کے والدین عرصہ ہوا فوت ہو چکے ہیں دنیا میں ہمارا کوئی نہیں۔ حتیٰ کہ ہمارا اپنا ذاتی گھر بھی نہیں۔ ہم دونوں درخت سے ٹوٹے ہوئے پتوں کی طرح ادھر ادھر ڈولتے پھرتے ہیں۔ کسی نے کھانے کو پوچھ لیا تو کھالیا ورنہ بھوکے ہی سو گئے۔ رات ہوئی تو کہیں بھی پڑ کر سو رہتے ہیں۔ قصے میں یہی ہماری روکھی پھیکی زندگی ہے۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے ہماری بے مزہ زندگی میں آج تک کوئی سنہرا دن نہیں آیا، اگر سنہرا دن آیا بھی تو وہ ہمارا اپنا گھر ہو گا جسے ہم اپنے ہاتھوں سے بنائیں گے اور جب یہ بن جائے گا تو ہم اس میں بیٹھ کر "ویڈیو" کھیلا کریں گے۔

اپنے سنہرے خوابوں کی تکمیل کے لئے ہم سارا دن سرکنڈوں کی لکڑیاں جمع کرتے ہیں۔ پہلے

ہم درختوں سے لکڑیاں توڑتے ہیں پھر ان سے پتیاں الگ کرتے اور پھر انہیں سُوکھنے کے لئے دھوپ میں رکھ دیتے ہیں۔ یہ بڑا مشکل اور محنت طلب کام ہے جس میں ہماری ہتھیلیاں بھی اکثر زخمی ہو جاتی ہیں۔

ابھی تک ہم نے صرف نواسی لکڑیاں جمع کی ہیں۔ مکان بنانے کے لئے ہمیں مزید نواسی لکڑیاں درکار ہیں جو کہ ہم جمع کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔

ایک دن جب کہ میں اور میری سہیلی رابرٹا پرانی بنچ پر بیٹھے سرکنڈوں کی ٹوٹی ہوئی شاخ سے پتیاں الگ کر رہے تھے اچانک رابرٹا چلا اٹھی:۔

"ارے میمی! دیکھو تو اینچ کے گاہک آئے ہیں!"

ہم جس جگہ بیٹھے تھے وہاں سے اینچ کی جوتوں کی دکان صاف نظر آ رہی تھی۔ دو بوڑھی عورتیں اس کی دکان کے باہر کھڑی شوکیس میں رکھے جوتے دیکھ رہی تھیں۔ رابرٹا دوڑتی ہوئی گئی اور شوکیس کے شیشے سے ناک ٹکا کر دکان کے اندر جھانکنے لگی۔

اب میرے پاس بھی اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ میں وہاں جاؤں اور دیکھوں چنانچہ میں نے ہاتھ جھاڑے اور دوڑ کر رابرٹا کے قریب جا کھڑی ہو گئی۔ ہم اتنے قریب تھے کہ بہت کچھ دیکھ اور سن سکتے تھے۔ شیشے کے پار دکان کے اندر کا سارا منظر صاف نظر آ رہا تھا۔ شوکیس کے اندر ایک مخصوص جگہ پر الٹے پاؤں کے جوتے سجے ہوئے تھے۔ دکان کے آخر میں ایک چھوٹا سا کمرہ تھا جس میں اینچ بیٹھا تھا۔ اس کے سامنے ایک میز تھی جس پر زرد رنگ کا غلاف بچھا تھا اور اس پر سینکڑوں کی تعداد میں چھوٹے بڑے سفید ڈبے رکھے تھے۔

"وہ سیدھے پاؤں کے جوتے کہاں رکھتا ہے؟ اس بات کا تو ہمیں علم ہونا چاہئے!" رابرٹا نے سرگوشی کی۔

"فکر نہ کرو آخر کار معلوم ہو ہی جائے گا!"

میں نے رابرٹا کو تسلی دی۔

ہم دونوں سہیلیوں کا خیال تھا کہ اینچ واقعی "مجرم" ہے، حالانکہ اس کا کہنا تھا کہ سفید ڈبوں میں سیدھے پاؤں کے جوتے رکھے ہیں لیکن ہمارا خیال تھا کہ وہ جھوٹ بولتا ہے۔ ہم اس بات کو جاننا چاہتے تھے کہ حقیقتاً سفید ڈبوں میں کیا "چیز" رکھی گئی ہے۔

"اینچ" (جوتوں کی دکان کا بوڑھا مالک) جوتوں کے اسٹور میں بیٹھا چائے پی رہا تھا۔ وہ بڑے مزے سے چائے کی چسکیاں لے رہا تھا اور باسی خبریں بڑے شوق سے سن رہا تھا۔

وہ اس وقت چونکا جب بوڑھی عورتوں نے دکان کا دروازہ کھولا۔ (دروازے کے ساتھ گھنٹی لگی تھی، جونہی کوئی دروازہ کھول کر اندر داخل ہوتا گھنٹی تیز آواز میں بجنے لگتی تھی)

بوڑھی عورتیں دکان کے اندر داخل ہوچکی تھیں۔ "انچ" نے بڑی ناراضگی کے ساتھ ان کی طرف دیکھا۔ ریڈیو سننے کے دوران اسے گاہکوں کی آمد اچھی نہیں لگتی تھی اور ویسے بھی حقیقتاً اسے گاہک اچھے نہیں لگتے تھے، خاص کر بوڑھی عورتیں اور باتونی عورتیں اسے سخت ناپسند تھیں۔

انچ آہستہ قدموں کے ساتھ چلتا ہوا اپنے چھوٹے سے کمرے سے باہر آیا۔ اس نے ایک پرانے رومال سے اپنا منہ پونچھا اور بوسیدہ سے سلیپر پاؤں میں ڈال لئے جو کہ کیش رجسٹر کے پاس رکھے ہوئے تھے۔

"ہم موسم خزاں کے جوتے دیکھنا چاہتے ہیں!" ان دونوں بوڑھی عورتوں میں سے ایک نے کہا۔

"لیکن جوتے بڑھیا (مہنگے) معیار کے ہونے چاہئیں" دوسری عورت بھی بول پڑی۔

دونوں عورتیں سنہری رنگ کے ہیٹ پہنے ہوئے تھیں اور ان کے کپڑے بھی نہایت زرق برق تھے۔ وہ اپنے لباس، رکھ رکھاؤ اور بات چیت سے امیر عورتیں لگ رہی تھیں۔

"ٹھیک ہے! بڑھیا کوالٹی کے جوتے دیکھئے!" انچ کا لہجہ روکھا سا تھا۔

"جوتوں کی ایڑھی مضبوط ہونی چاہئے!"

"ہاں بھئی جوتے مضبوط اور پائیدار ہونے چاہئے۔ پچھلے موسم خزاں میں میں نے اپنے بھائی سے جو جوتے منگوائے تھے وہ بہت گھٹیا معیار کے تھے۔ ایک مہینہ بھی نہیں چلے۔"

اس بوڑھی عورت نے کہا جس کی ناک پر باریک سنہری فریم والا چشمہ لگا تھا اور جسے باتوں کے دوران کبھی وہ اوپر کرتی تھی اور کبھی نیچے۔

جب کہ دوسری بوڑھی عورت خواہ مخواہ ایک چھوٹے سے رومال سے ماتھے پر آیا ہوا پسینہ پونچھ رہی تھی حالانکہ سردیوں کا موسم تھا اور پسینہ پونچھنے کا کوئی جواز نہ تھا۔

بوڑھی عورتیں خوب باتیں کر رہی تھیں جب کہ انچ بڑے غور سے ان کے پیروں کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"موسم خزاں بھی کتنی جلدی جلدی آجاتا ہے!"

"میں ہر موسم کے الگ جوتے خریدتی ہوں!"

"میرا بھی یہی حال ہے!"

"مجھے مہنگے اور اعلیٰ معیار کے جوتوں کا بہت شوق ہے!"

"جو تمہارا شوق ہے وہی میرا ہے۔ شاید ہم دونوں کا ذوق ایک جیسا ہے۔"

"باتیں کم کرو اور مجھے یہ بتاؤ کہ جو جوتے تم پہنے ہوئی ہو اس میں کیا خرابی ہے؟" اینچ نے بوڑھی عورتوں کے پیروں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

بوڑھی عورتوں کی باتوں کو بریک لگ گیا وہ ہکا بکا ہو کر ایک دوسرے کی شکل دیکھنے لگیں۔ اینچ ان کے جوتوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

"اتنے اچھے جوتے ہیں۔ ابھی کافی عرصے تک چل سکتے ہیں۔"

اتنا کہہ کر وہ مڑا۔ شوکیس میں رکھے ایک دو جوتوں کو کپڑے سے جھاڑا پھر اس نے اپنے دونوں ہاتھ ہوا میں لہرا کر غصے سے کہا:

"آج کل کے لوگوں کو نہ جانے کیا ہو گیا ہے۔ یہ چاہتے ہیں کہ مال آتا رہے اور آتا رہے۔ ان کی ہوس ہے کہ بڑھتی ہی چلی جا رہی ہے۔ احمق اور فضول خرچ لوگ۔"

اینچ بڑبڑاتا ہوا واپس اپنے چھوٹے سے کمرے میں چلا گیا اور وہاں جا کر اس نے ریڈیو کا بٹن آن کر دیا اور کرسی پر بیٹھ کر ریڈیو سننے میں مشغول ہو گیا۔

بوڑھی عورتیں اپنی بے عزتی پر بڑی چراغ پا تھیں۔ ان کا خیال تھا کہ اینچ نے ان کی بے عزتی کی ہے۔ بڑے غصے کے عالم میں وہ بڑبڑاتی ہوئیں اس طرح باہر نکلیں کہ ان کی ناکیں ہوا میں تنی ہوئی تھیں اور آنکھوں سے انگارے برس رہے تھے۔

جیسے ہی وہ دروازہ کھول کر باہر گئیں۔ انہوں نے زور سے دروازے کو بند کیا۔ دروازے کی گھنٹی زور سے بجی لیکن اینچ بڑے سکون سے بیٹھا ریڈیو سنتا رہا۔

بوڑھی عورتوں کے چلے جانے کے بعد رابرٹا نے کہا۔

"تم نے دیکھا یہ پراسرار بوڑھا کتنا بدمزاج ہے؟"

"تم ٹھیک کہتی ہو!" میں نے رابرٹا کی بات کا جواب دیا۔

ہم لوگ دکان کے پاس سے ہٹ گئے۔

کچھ ہی دیر بعد "اینچ" اپنی دکان سے باہر نکلا اس نے جوتوں کے شوکیس میں "کلوز" کا کارڈ لگا دیا جس کا مطلب تھا "کاروبار بند ہے!"

اس کے بعد وہ دکان کے اندر گیا اور جب وہ باہر آیا تو اس کے کاندھے پر ہرے رنگ کا لمبا سا تھیلا تھا جسے کاندھے پر ڈالے وہ پگڈنڈی پر چلنے لگا۔ اس کی ناک غصے سے ہوا میں تنی ہوئی نہیں تھی

بلکہ وہ نہایت خوشگوار موڈ میں دکھائی دے رہا تھا اور اپنے ہونٹوں سے کوئی خوبصورت دُھن سیٹی کی صورت میں بجا رہا تھا۔

"کچھ دیکھا تم نے؟" رابرٹا نے معنی خیز انداز میں کہا

"ہاں! شاید وہ کہیں جا رہا ہے!"

آؤ چلیں اور اس کا پیچھا کریں اور یہ معلوم کریں کہ وہ کس سے لڑنے جا رہا ہے؟"

"لڑنے؟" "ہاں لڑنے! میرا خیال ہے کہ اس نے کسی سنسان جگہ کسی ریڈانڈین (امریکا کا قدیم باشندہ) کو قید کیا ہوا ہے اور اب اس سے لڑنے جا رہا ہے۔"

مجھے ریڈانڈین اچھے لگتے ہیں! میں رابرٹا کو یہ بات بتانا چاہتی تھی لیکن رابرٹا نے بولنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ میرے منہ پر ہاتھ رکھ کر بولی:۔

"خاموشی کے ساتھ تیز تیز چلو کہیں ایسا نہ ہو ہم اس پراسرار بوڑھے کو کھو دیں۔"

ہم بڑی خاموشی کے ساتھ اینچ کے پیچھے چلنے لگے۔

ہم اس سے پورے تیس قدم کے فاصلے پر چل رہے تھے لہٰذا اسے اس بات کا شک نہیں ہو سکتا تھا کہ ہم اس کا پیچھا کر رہے ہیں۔

راستے میں درخت کی شاخیں اور جھاڑیاں آ رہی تھیں جنہیں اینچ اپنے ہاتھوں سے ہٹاتا ہوا، راستہ بناتا ہوا، آگے بڑھ رہا تھا۔ اس نے ایک بار بھی پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا تھا اور اسے اس بات کی کوئی پروا نہ تھی کہ کوئی اس کے پیچھے آ رہا ہے۔

اینچ کافی دیر تک آڑھے ٹیڑھے راستوں پر چلتا رہا۔ پھر وہ ایک ڈھلوان راستے پر چڑھا اور جب وہ ڈھلوان راستے کے دوسری طرف اُترا تو اس کے سامنے ناریل کے درختوں کے درمیان ایک خوبصورت سی جھیل آ گئی۔ وہ دھپ سے گرا اور کسی تھکی ہوئی بڑھیا کی طرح جھیل کے کنارے بیٹھ گیا۔

میں اور رابرٹا تیس قدم دور ایک درخت کے پیچھے چھپ کر "اینچ" کو دیکھنے لگے۔

"یہ جھیل جتنی چھوٹی ہے اتنی ہی گہری نظر آ رہی ہے" میں نے رابرٹا سے کہا۔ رابرٹا بولی "لاش کو دفن کرنے کے لئے اتنی بہترین جگہ کوئی اور نہیں ہو سکتی۔ "لاش کو؟!!!" میری آنکھوں کی پتلیاں رابرٹا کی یہ بات سن کر مارے خوف کے پھیل گئیں۔

ہاں! لاش کو!! اینچ نے یہیں کہیں اس ریڈانڈین کو قید کیا ہوا ہے جب وہ اسے ہلاک کر لے گا تو جھیل میں پھینک دے گا اور مچھلیاں اس بے چارے ریڈانڈین کی لاش کو نوچ نوچ کر کھا جائیں گی۔"

رابرٹا بولی۔

رابرٹا کی یہ خوفناک بات سن کر میں نے غصے سے کہا:

"نہیں نہیں! میں اینچ کو ایسا نہیں کرنے دوں گی۔ میں ریڈانڈین کو مرنے نہیں دوں گی۔"

"خاموش!!!" میری بات کے مکمل ہوتے ہی رابرٹا سرگوشی میں بولی۔

"وہ دیکھو! اینچ اپنے ہرے رنگ کے تھیلے میں سے گھوڑے کو مارنے والا "چابک" نکال رہا ہے۔ اس چابک سے وہ غریب ریڈ انڈین کی پٹائی لگائے گا۔"

میں اسے ایسا نہیں کرنے دوں گی میں اس ظالم بوڑھے کے پاس جاؤں گی اور اسے ریڈانڈین کو مارنے سے روکوں گی۔ میں جا رہی ہوں!"

رابرٹا نے جلدی سے میرا بازو پکڑ لیا۔

"خبردار! اس ظالم بوڑھے کے قریب نہ جانا۔ وہ تمہیں بھی جان سے مار دے گا۔"

"میری جان چلی جائے لیکن بے چارے غریب ریڈانڈین کی جان تو بچ جائے گی۔"

"خبردار! ہیرو بننے کی کوشش نہ کرو!" رابرٹا سرگوشی میں چلائی۔

ہماری باتوں کے دوران اینچ اپنا تھیلا کھول چکا تھا۔

"ارے! اس کے پاس چابک تو نہیں۔ یہ تو مچھلی پکڑنے کا کانٹا ہے۔ بے جان سا۔" رابرٹا کے لہجے میں مایوسی تھی۔

میں نے کہا۔ "ہاں تمہارا اندازہ غلط نکلا۔" "شاید!" رابرٹا بولی۔

اینچ نے ایک مضحکہ خیز مچھلی کا کانٹا جو کہ ٹیڑھا سا تھا تھیلے سے نکالا۔ اس کی ڈوری میں چارا لگا کر ڈوری پانی میں پھینک دی اور کانٹے کو ایک درخت کے ساتھ باندھ دیا گویا مچھلی پکڑنا..... اب درخت کا کام تھا۔

تب مطمئن نگاہوں سے اس نے اپنے کام کا جائزہ لیا اور پھر ناریل کے ایک بڑے سے درخت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ اس نے اپنی قمیص کی بڑی سی جیب سے دو باسی "سینڈوچز" نکالے پھر اس نے گردن گھما کر آواز لگائی:

"لڑکیو! سامنے آجاؤ۔ میں نے تمہیں دیکھ لیا ہے۔"

اینچ کی یہ بات سن کر میں اور رابرٹا گھبرا گئے۔ اس نے ہمیں کس طرح دیکھ لیا؟ جب کہ ہم اس سے تیس قدم دور ایک درخت کے پیچھے چھپے تھے۔

بلکہ وہ نہایت خوشگوار موڈ میں دکھائی دے رہا تھا اور اپنے ہونٹوں سے کوئی خوبصورت دُھن سیٹی کی صورت میں بجا رہا تھا۔

"کچھ دیکھا تم نے؟" رابرٹا نے معنی خیز انداز میں کہا

"ہاں! شاید وہ کہیں جا رہا ہے!"

آؤ چلیں اور اس کا پیچھا کریں اور یہ معلوم کریں کہ وہ کس سے لڑنے جا رہا ہے؟"

"لڑنے؟" "ہاں لڑنے! میرا خیال ہے کہ اس نے کسی سنسان جگہ کسی ریڈانڈین (امریکا کا قدیم باشندہ) کو قید کیا ہوا ہے اور اب اس سے لڑنے جا رہا ہے۔"

مجھے ریڈانڈین اچھے لگتے ہیں! میں رابرٹا کو یہ بات بتانا چاہتی تھی لیکن رابرٹا نے بولنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ میرے منہ پر ہاتھ رکھ کر بولی:۔

"خاموشی کے ساتھ تیز تیز چلو کہیں ایسا نہ ہو ہم اس پراسرار بوڑھے کو کھو دیں۔"

ہم بڑی خاموشی کے ساتھ اینچ کے پیچھے چلنے لگے۔

ہم اس سے پورے تیس قدم کے فاصلے پر چل رہے تھے لہٰذا اسے اس بات کا شک نہیں ہو سکتا تھا کہ ہم اس کا پیچھا کر رہے ہیں۔

راستے میں درخت کی شاخیں اور جھاڑیاں آ رہی تھیں جنہیں اینچ اپنے ہاتھوں سے ہٹاتا ہوا، راستہ بناتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ اس نے ایک بار بھی پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا تھا اور اسے اس بات کی کوئی پروا نہ تھی کہ کوئی اس کے پیچھے آ رہا ہے۔

اینچ کافی دیر تک آڑھے ٹیڑھے راستوں پر چلتا رہا۔ پھر وہ ایک ڈھلوان راستے پر چڑھا اور جب وہ ڈھلوان راستے کے دوسری طرف اُترا تو اس کے سامنے ناریل کے درختوں کے درمیان ایک خوبصورت سی جھیل آ گئی۔ وہ دھپ سے گرا اور کسی تھکی ہوئی بڑھیا کی طرح جھیل کے کنارے بیٹھ گیا۔

میں اور رابرٹا تیس قدم دور ایک درخت کے پیچھے چھپ کر "اینچ" کو دیکھنے لگے۔

"یہ جھیل جتنی چھوٹی ہے اتنی ہی گہری نظر آ رہی ہے" میں نے رابرٹا سے کہا۔ رابرٹا بولی "لاش کو دفن کرنے کے لئے اتنی بہترین جگہ کوئی اور نہیں ہو سکتی۔ "لاش کو؟!!!" میری آنکھوں کی پتلیاں رابرٹا کی یہ بات سن کر مارے خوف کے پھیل گئیں۔

ہاں! لاش کو!! اینچ نے یہیں کہیں اس ریڈانڈین کو قید کیا ہوا ہے جب وہ اسے ہلاک کر لے گا تو جھیل میں پھینک دے گا اور مچھلیاں اس بے چارے ریڈانڈین کی لاش کو نوچ نوچ کر کھا جائیں گی۔"

رابرٹا بولی۔

رابرٹا کی یہ خوفناک بات سن کر میں نے غصے سے کہا:

"نہیں نہیں! میں اینچ کو ایسا نہیں کرنے دوں گی۔ میں ریڈانڈین کو مرنے نہیں دوں گی۔"

"خاموش!!!" میری بات کے مکمل ہوتے ہی رابرٹا سرگوشی میں بولی۔

"وہ دیکھو! اینچ اپنے ہرے رنگ کے تھیلے میں سے گھوڑے کو مارنے والا "چابک" نکال رہا ہے۔ اس چابک سے وہ غریب ریڈ انڈین کی پٹائی لگائے گا۔"

میں اسے ایسا نہیں کرنے دوں گی، میں اس ظالم بوڑھے کے پاس جاؤں گی اور اسے ریڈانڈین کو مارنے سے روکوں گی۔ میں جا رہی ہوں!"

رابرٹا نے جلدی سے میرا بازو پکڑ لیا۔

"خبردار! اس ظالم بوڑھے کے قریب نہ جانا۔ وہ تمہیں بھی جان سے مار دے گا۔"

"میری جان چلی جائے لیکن بے چارے غریب ریڈانڈین کی جان تو بچ جائے گی۔"

"خبردار! ہیرو بننے کی کوشش نہ کرو!" رابرٹا سرگوشی میں چلائی۔

ہماری باتوں کے دوران اینچ اپنا تھیلا کھول چکا تھا۔

"ارے! اس کے پاس چابک تو نہیں۔ یہ تو مچھلی پکڑنے کا کانٹا ہے۔ بے جان سا۔" رابرٹا کے لہجے میں مایوسی تھی۔

میں نے کہا۔ "ہاں تمہارا اندازہ غلط نکلا۔" "شاید!" رابرٹا بولی۔

اینچ نے ایک مضحکہ خیز مچھلی کا کانٹا جو کہ ٹیڑھا سا تھا تھیلے سے نکالا۔ اس کی ڈوری میں چارا لگا کر ڈوری پانی میں پھینک دی اور کانٹے کو ایک درخت کے ساتھ باندھ دیا گویا مچھلی پکڑنا..... اب درخت کا کام تھا۔

تب مطمئن نگاہوں سے اس نے اپنے کام کا جائزہ لیا اور پھر ناریل کے ایک بڑے سے درخت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ اس نے اپنی قمیص کی بڑی سی جیب سے دو باسی "سینڈوچز" نکالے پھر اس نے گردن گھما کر آواز لگائی:

"لڑکیو! سامنے آجاؤ۔ میں نے تمہیں دیکھ لیا ہے۔"

اینچ کی یہ بات سن کر میں اور رابرٹا گھبرا گئے۔ اس نے ہمیں کس طرح دیکھ لیا؟ جب کہ ہم اس سے تیس قدم دور ایک درخت کے پیچھے چھپے تھے۔

ہمارا مزید چھپنا اب فضول تھا لہٰذا ہم اینچ کے قریب چلے گئے۔ اس نے ایک سینڈوچ خود لیا جب کہ دوسرے سینڈوچ کے دو ٹکڑے کرنے کے بعد ایک ایک ٹکڑا اس نے ہمارے ہاتھوں میں پکڑا دیا۔

ہم خاموشی کے ساتھ سینڈوچز کھانے لگے۔ سینڈوچز ایک دن پرانے تھے لیکن بہت مزیدار تھے کیونکہ وہ تلی ہوئی مچھلی اور سوجی کے آٹے سے بنائے گئے تھے۔ کچھ دیر تک ہمارے درمیان خاموشی رہی پھر اچانک رابرٹا نے اس خاموشی کو توڑ ڈالا اس نے اینچ سے سوال کیا:

"تمہاری عمر کتنی ہوگی؟"

سوال سن کر اینچ اٹھ کھڑا ہوا۔ سینڈوچ کا وہ چھوٹا سا ٹکڑا جو بچ گیا تھا اس نے واپس اپنی قمیص کی بڑی سی جیب میں رکھ لیا۔ وہ ابھی تک خاموش تھا شاید وہ رابرٹا کے سوال سے بچنا چاہ رہا تھا! شاید اپنی عمر بتانا نہیں چاہتا تھا بالکل عورتوں کی طرح جیسا کہ عورتیں کرتی ہیں۔

"شاید! تم اپنی عمر بتانا نہیں چاہتے حالانکہ تم کافی بوڑھے ہو، آثار قدیمہ کے نوادرات کی طرح!" رابرٹا نے ایک لمحے توقف کیا پھر دوسرے ہی لمحے وہ بولی:

"خیر چھوڑو اس بات کو۔ تم یہ بتاؤ کہ تمہارے پاس پیسے کہاں سے آتے ہیں؟ اور تم اپنی گزر اوقات کس طرح کرتے ہو جب کہ تمہارے جوتے بکتے بھی نہیں!!!"

"بس کرو، بہت ہو چکی مس ٹوٹی فروٹی! تم بہت بدتمیز ہو۔"

اینچ غصے سے دھاڑا۔ میں اور رابرٹا سہم گئے۔ ہم سمجھے اینچ ہماری پٹائی لگائے گا (باقی آئندہ)

پرندے ہماری کائنات کا حسن ہیں
پرندے نظامِ حیات کا جزوِ لازم ہیں
انھیں نہ ماریئے
انھیں ان کی فطری عمر تک جینے کا حق دیجیے

مناسب دام ۔ بہت آرام

آنکھ مچولی

گھر بیٹھے پایئے

86 روپے بچایئے

آنکھ مچولی کے ۱۰ عام اور ۲ خاص شماروں کی سالانہ قیمت مع رجسٹرڈ ڈاک خرچ ۲۳۶ روپے بنتی ہے

مگر

ممبر شپ حاصل کرنے پر ۸۶ روپے کی خصوصی بچت

آپ ہمیں ۱۵۰ روپے کا منی آرڈر روانہ کر دیجئے
ہم آپ کو سال بھر آنکھ مچولی باقاعدگی سے بھجواتے رہیں گے۔

منی آرڈر فارم پر اپنا مفصل نام اور پتہ ضرور لکھیے۔
دیگر ممالک کے لئے زرِ سالانہ کی شرح ۳۰۰/- روپے ہے

منی آرڈر اس پتے پر روانہ کریں

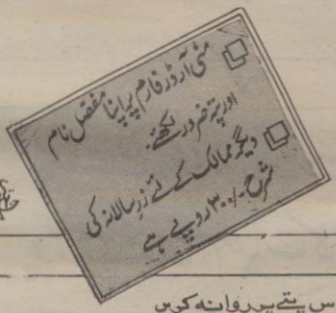

ماہنامہ آنکھ مچولی ۔ پی آئی بی کالونی ۔ کراچی نمبر ۵ ۔۔۔

برّاعظم آسٹریلیا کا ایک مشہور جانور

کنگرو

مکیش کمار

ساری گھاس کھا جاتا ہے!

برِّاعظم آسٹریلیا بھی افریقہ کی طرح اپنے نادر اور عجیب جانوروں کی وجہ سے خاصا مشہور ہے۔ کنگرو بھی آسٹریلیا ہی کا ایک انفرادی جانور ہے۔ کنگرو دوسرے کئی جانوروں سے اس اعتبار سے بھی مختلف ہے کہ ایک تو اس کی چاروں ٹانگیں برابر نہیں ہوتیں۔ یعنی اس کی اگلی ٹانگیں چھوٹی اور پچھلی ٹانگیں خاصی بڑی ہوتی ہیں۔ دوسرے مادہ کنگرو کے پیٹ پر ایک تھیلی سی ہوتی ہے۔ اسی تھیلی کے اندر مادہ کنگرو اپنے بچے پالتی ہے۔ بچے کو اسی تھیلی کے اندر خوراک ملتی ہے اور بچہ پڑا پڑا مادہ کا دودھ پیتا رہتا ہے۔ ماں اپنے بچے کی حفاظت بھی اسی تھیلی کے سہارے سے کرتی ہے۔ ماہرین حیوانات نے کنگرو کی پانچ مشہور قسمیں بتائی ہیں۔

(۱) غزال کنگرو (۲) بڑا اور بھورا کنگرو (۳) سرخ کنگرو (۴) دلاور یعنی بڑا کنگرو (۵) مغربی بھورا کنگرو

کنگرو کی یہ ساری اقسام گھاس پھونس کھاتی ہیں۔ اور کئی ایک خاص بوٹیاں بھی ان کی خوراک بنتی ہیں۔

ہر کنگرو کی ٹانگوں میں بہت قوت ہوتی ہے۔ پچھلی ٹانگیں تو ہر کنگرو کے لئے معاون ہوتی ہے۔ اور کنگرو کی دُم اصل میں اس کی اگلی اور قدرے کمزور ٹانگوں کی کسر پوری کر دیتی ہے۔ کنگرو اس دم کے سہارے اپنی اگلی ٹانگیں اٹھا کر کرسی کی مانند بیٹھ جاتا ہے۔ کنگرو جب بھاگتا ہے تو یہی دم اس کے جسم کے متوازی ہو جاتی ہے۔ اور تیز سے تیز بھاگنے میں مدد دیتی ہے۔ کنگرو بچوں کی پیدائش کے لحاظ

سے بھی بڑا عجیب و غریب جانور ہے۔ ہر مادہ صرف ایک ماہ کے اندر بچہ دے دیتی ہے لیکن کنگرو کا بچہ جو پیدا ہوتا ہے وہ اتنا چھوٹا ہوتا ہے کہ اسے چائے کے چمچے میں ڈالا جا سکتا ہے۔ بچہ پیدائش کے وقت صرف ایک انچ یا اس سے بھی چھوٹا ہوتا ہے۔

بچے کی حالت کمزور ہوتی ہے۔ ابھی اس کے ہاتھ پیر بننے والے ہوتے ہیں۔ آنکھیں بھی نہیں کھلی ہوتیں حالانکہ دوسرے جانوروں کے بچے پیدا ہی اس وقت ہوتے ہیں جب وہ جسمانی طور پر مکمل ہو چکے ہوتے ہیں۔ کنگرو کا بچہ پیدا ہونے کے تھوڑے عرصے بعد خود ہی رینگ کر ماں کی تھیلی میں چلا جاتا ہے۔ مجموعی طور پر کنگرو کا ہر بچہ دس گیارہ ماہ تک ماں کی تھیلی پر انحصار کرتا ہے اور اس کے بعد وہ گھاس پھونس کھانا شروع کر دیتا ہے۔ ماں بچے کو تھیلی کے اندر پرورش کرتی ہے اور بھاگتے ہوئے بھی بچہ تھیلی میں موجود رہتا ہے۔ کنگرو باقی دوسرے جانوروں کے مقابلے میں ایک کم عمر والا جانور ہے۔ بیرونی ماحول کے اعتبار سے کنگرو کی لمبی عمر صرف چھ سے آٹھ سال تک ہوتی ہے۔ اگر کوئی دشمن حملہ کر دے تو کنگرو اتنی عمر کو بھی نہیں پہنچتا۔

دنیا بھر میں کنگرو کی قسم کے قریباً چالیس قسم کے جانور اور بھی موجود ہیں لیکن وہ سب جانور چھوٹے چھوٹے ہوتے ہیں۔ ان میں کئی تو آسٹریلیا ہی میں ہیں۔ اور کئی نیوگن اور اس کے جزائر پر موجود ہیں۔

اڑتی چڑیا ہلاک

ماجد خان کے والد جہانگیر خان وہ واحد کھلاڑی ہیں جن کی گیند سے ایک اڑتی چڑیا ہلاک ہو گئی۔ یہ میچ کرکٹ کا تھا۔ وہ چڑیا آج تک آسٹریلیا میں محفوظ ہے۔

مرسلہ: انعام الحق مون، لاہور

کنگرو کے بہت کم دشمن جانور موجود ہیں۔ صرف آسٹریلیا کے جنگلی کتے اس کے سب سے بڑے دشمن قرار دیئے جاتے ہیں۔ شکاری لاکھوں کی تعداد میں اس جانور کا شکار کر چکے ہیں۔ وہ شکار بھی اس کی کھال اور گوشت کے لئے کرتے ہیں اس کی کھال کے اچھے جوتے بنتے ہیں اور گوشت کتوں کو کھلایا جاتا ہے۔ آسٹریلیا کے مویشی خانوں کے مالکوں کا کہنا ہے کہ یہ جانور بہت زیادہ گھاس چرتے ہیں۔ ان کے چرنے کے بعد دوسرے گھریلو جانوروں کے لئے گھاس نہیں بچتی اس لئے بھی اسے شکار کر لینا چاہئے۔

کنگرو کو غیر سرکاری طور پر آسٹریلیا کا نشان بھی سمجھا جاتا ہے۔ لیکن لوگوں نے کنگروؤں کو اس بے دردی اور بے رحمی سے مارا اور شکار کیا ہے کہ یہ خطرہ پیدا ہو رہا ہے کہ کہیں یہ عجیب و غریب جانور ختم ہی نہ ہو جائے۔

۱۹۷۳ء میں آسٹریلیا کی پارلیمنٹ نے ایک قانون پاس کیا تھا کہ دوسرے ممالک کو کنگرو اور کنگرو کی کھالیں بیچنی بند کر دی جائیں۔ اس طرح لوگ اس کے شکار سے رک جائیں گے۔

سب ٹھیک ہے

فرزانہ روحی

"پودوں کی اچھی طرح دیکھ بھال کرنی ہے، مرغیوں کا خیال رکھنا ہے، چڑیوں کو وقت پر دانہ پانی دینا ہے، سارے گھر کی صفائی رکھنی ہے، ہر کام وقت پر کرنا ہے اور بلا ضرورت کوئی گھر سے باہر

میں کوئی گڑبڑ ہوئی تو تم سے ہی جواب طلبی ہوگی اور سزا بھی ملے گی۔"

"کیوں ابو! صرف مجھ سے ہی کیوں، گڑبڑ کوئی بھی کر سکتا ہے لہٰذا جواب دہ بھی وہی ہوگا۔" "وہ تو

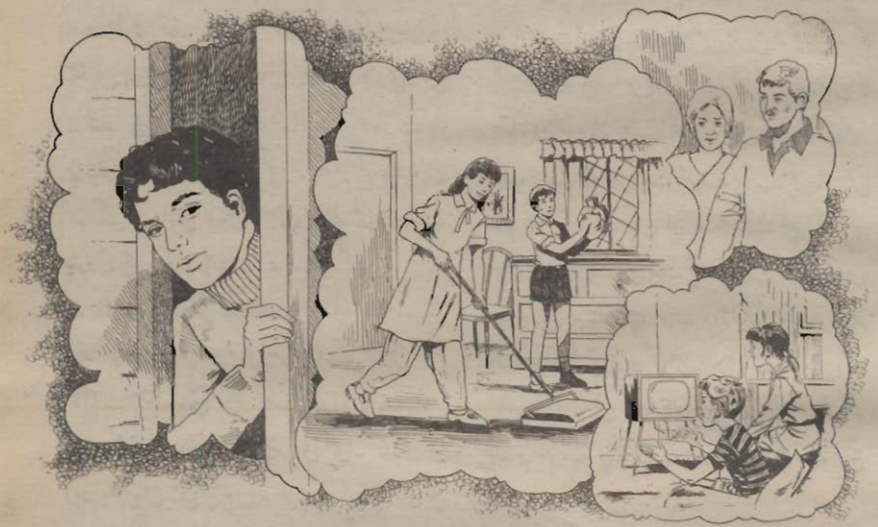

نہیں جائیگا۔" ابو نے چاروں بہن بھائیوں کو ہدایات دیں۔

"وکی بیٹا! تم سب سے بڑے ہو لہٰذا تمام تر ذمہ داری تم پر ہی عائد ہوتی ہے۔ اگر میری غیر حاضری

ہوگا ہی مگر پہلے آپ سے پوچھا جائیگا، کیونکہ آپ سب سے بڑے ہیں اور میں آپ کو ان سب کا اور اس گھر کا سربراہ مقرر کر رہا ہوں، سمجھے آپ؟"

"جی۔" وکی نے اثبات میں سر ہلایا۔

"اب تم چاروں آپس میں اپنی مرضی کے مطابق کام بانٹ لو۔ واپسی میں تم سب کے لئے میں اچھے اچھے تحائف لاؤں گا۔" تحائف کا ذکر سنتے ہی چاروں نے اپنی اپنی پسند کی چیزوں کے نام گنوانے شروع کر دیئے۔

دراصل فہیم کے چچا کا بیرونِ ملک انتقال ہو گیا تھا۔ اس لئے انھیں اپنے چچا کے سفرِ آخرت میں شرکت کے لئے اچانک جانا پڑ گیا تھا۔ اتنی جلدی صرف وہ اور بیگم ہی جا سکتے تھے۔ بچوں کا جانا بہت مشکل تھا۔ حالانکہ اسکولوں میں گرمیوں کی چھٹیاں ہو چکی تھیں۔ مگر سب کچھ اتنی جلدی ممکن نہ تھا۔ چچا کی موت پر فہیم صاحب ہر صورت جانا چاہتے تھے اور ان کی آرزو تھی کہ کم از کم چالیسواں کر کے ہی واپس لوٹیں۔ اسی سلسلے میں وہ اپنے چاروں بچوں کو ہدایات دے رہے تھے۔

امی ابو کی روانگی کے بعد وکی بھائی نے سب کو اکٹھا کیا اور ہر فرد کو اسکی مرضی کے مطابق کام سونپا۔ مثلاً باجی کی ذمہ داری امورِ خانہ داری یعنی کھانے پکانے وغیرہ کی تھی۔ عدنان کی ذمہ داریوں میں چڑیوں، مرغیوں اور پودوں کی دیکھ بھال تھی۔ وسیم کے حصے میں دیگر چھوٹے موٹے کام آئے جبکہ وکی بھیا ان تمام افراد کے اسسٹنٹ قرار پائے۔ گویا ان تمام کاموں میں وہ سب کا ہاتھ بٹایا کریں گے۔

دوسرے دن صبح سے ہی سب نے اپنے اپنے فرائض کی انجام دہی شروع کر دی۔ باجی نے ناشتے میں گرم گرم پراٹھے اور آملیٹ بنائے۔ دوپہر کے کھانے کی تیاری انہوں نے صبح ہی کر لی تاکہ عین وقت پر پریشانی نہ ہو۔ عدنان نے پرندوں کو دانہ ڈالا اور پودوں کی آبیاری کی۔ وسیم نے بستر کی چادریں درست کیں، بوتلوں میں تازہ پانی بھر کر انھیں فریج میں رکھا۔ شیلف کی صفائی کی۔ بے ترتیب سامان کو ترتیب سے رکھا۔ پھر ہوم ورک نکال کر بیٹھ گیا۔

دن یونہی ٹھیک ٹھاک گزر رہے تھے کہ ایک دوپہر بہت بُرا ہوا۔ جانے کس طرح مرغیوں کا ڈربہ کھلا رہ گیا۔ مرغیوں نے تو نکل کر کیاریوں کا ستیاناس کر دیا۔ ہرے بھرے پتوں سے لدے اور رنگ برنگے پھولوں سے بھرے پودے پل بھر میں گنجے ہو گئے۔ عدنان اور وسیم نے گھیر گھیر کر مرغیوں کو پکڑنا شروع کیا۔ پورے لان میں مرغیوں نے انہیں اپنے پیچھے خوب دوڑایا۔ جبکہ مرغا پھڑ پھڑاتا ہوا دیوار پر چڑھ گیا اور پڑوسی کے گھر میں کود گیا۔ بڑی مشکل سے قابو میں آیا، اس نے جگہ جگہ وسیم کے پنجے مارے اور اپنی چونچ سے نوچ لیا۔

"کتنے شوق سے ابو نے یہ لان خود تیار کیا تھا۔" لان کا حشر دیکھ کر وسیم کا دل رونے کو چاہ رہا تھا۔ "جو ہو گیا اسے بھول جاؤ۔ ہم دوبارہ نئے پودے لگائیں گے۔ ابو کے آنے تک تو یہ پودے بڑے ہو جائیں گے۔" بھیا نے وسیم کو دلاسا دیا۔

"آج ہم اس پہلوان مرغے کو ذبح کر دیں گے بہت زور آور ہے۔ اس خطرناک مرغ کو ہم ہرگز نہیں پال سکتے۔" بھیا نے وسیم کے زخموں کی ڈیٹول سے صفائی کرتے ہوئے کہا۔

شام کو وکی بھیا نے مرغ کو ذبح کر دیا۔ ذبح ہوتے وقت بھی وہ خوب اچھلا کودا اور بھاگنے کی کوشش کی۔ گھر کے پلے ہوئے اس مرغ کا گوشت بے حد لذیذ تھا۔ سب نے مزے لیکر کھایا مگر انھیں یہ مزہ تب بہت مہنگا پڑا جب رات کو وسیم کی طبیعت خراب ہوگئی۔ وہ پیٹ پکڑ کر ہائے ہائے کر رہا تھا اور سب اسکے گرد جمع تھے، شاید اس نے ہاتھ دھوئے بغیر کھانا کھالیا تھا یا پھر ضرورت سے زیادہ کھالیا تھا۔ رات جاگ کر کٹی۔ صبح ہوتے ہی ڈاکٹر صاحب کو بلایا گیا۔ ڈاکٹر نے وسیم کو اسپتال میں داخل کرانے کا مشورہ دیا کیونکہ اسکے جسم میں پانی کی کمی پیدا ہوگئی تھی۔ پانچویں دن وسیم کو اسپتال سے رخصت ملی۔ وہ گھر تو آگیا مگر اسے ابھی مزید آرام کی ضرورت تھی۔ وہ بہت کمزور ہوگیا تھا۔ تینوں بہن بھائی وسیم کی دیکھ بھال میں لگ گئے۔ وسیم زیادہ عرصے بستر پر لیٹے رہنے والا لڑکا نہیں تھا جلدی سے بستر سے اٹھ گیا اور زندگی معمول پر آگئی۔ مگر اتنے دنوں میں گھر کی حالت بالکل تبدیل ہوچکی تھی۔ تمام چیزیں گرد میں اٹی پڑی تھی کچن میں جگہ جگہ گندے برتن پھیلے تھے جن پر مکھیاں بھنک رہی تھیں۔ چڑیوں کا دانا ختم ہوچکا تھا۔ پانی کا برتن الٹا پڑا تھا۔ بھوک پیاس اور گرمی کی شدت سے چند چڑیاں مرگئی تھیں۔ مرغیوں کے انڈے نکالے نہ جانے کے باعث دڑبوں میں ٹوٹے پڑے تھے جن کی ناگوار بو ہر طرف پھیلی تھی۔ مرغیاں کوں کوں کر کے شور مچا رہی تھیں۔ کیاریاں ہنوز اجڑی تھی..... اور پانی نہ ملنے کے باعث بچے کچے پودے سوکھ گئے تھے۔

امی ابو کی واپسی میں تھوڑے سے دن رہ گئے تھے اور اب تک سب کچھ بے ترتیب تھا۔ بھیا نے سب کو جمع کیا اور مشورہ کرنے لگے کہ کون کون سے ایسے پودے ہیں جو جلدی جلدی بڑھتے ہیں تاکہ امی ابو کے آنے تک کیاری تیار ہوجائے۔ ابھی وہ سب گفتگو میں مصروف ہی تھے کہ فون کی

لمحہ

ایک شہنشاہ اپنے قصرِ شاہی میں جلوہ افروز تھا۔ ندیم حلقہ باندھے بیٹھے تھے۔ عیش و نشاط کی محفل گرم تھی۔ سرمستی کے عالم میں بادشاہ نے نعرہ لگایا۔ "یہ لمحہ ہماری زندگی کا بہترین لمحہ ہے ہمیں دنیا کا کوئی غم نہیں۔" ایک خستہ حال درویش کے کان میں آواز پڑی۔ للکار کر بولا۔ "بجا ہے سرکار کوئی غم نہیں۔ کیا ہمارا غم بھی نہیں"؟ بادشاہ کو یہ صدا پسند آئی۔ ہزار اشرفیوں کی تھیلی اٹھائی۔ کھڑکی سے ہاتھ باہر نکالا اور کہا "جھولی پھیلاؤ" درویش نے کہا "تن پہ کپڑا نہیں جھولی کہاں سے لاؤں؟"

مرسلہ..... جاوید اقبال عاجز ڈونگہ بونگہ

گھنٹی بجی۔ عدنان نے ریسیور اٹھایا۔ ابو نے خیریت دریافت کرنے کیلئے فون کیا تھا۔ بھیا نے لپک کر ریسیور عدنان سے لیا اور بولنے لگے۔

"السلام علیکم ابو جی، جی ہاں ..... ہم سب خیریت سے ہیں..... آپ بالکل فکر مند نہ ہوں ..... سب ..... سب ٹھیک ہے۔"

امی ابو نے باری باری سب سے باتیں کیں اور مزید ہدایات دیں۔

"ارے بھیا! ہم نے مرغے کی قربانی کا تو بتایا ہی نہیں ابو کو۔" باجی نے یاد دلایا۔

"چھوڑو، یہ بھی کوئی بتانے کی بات ہے۔" بھیا نے لاپروائی سے کہا۔

"اچھا۔ وسیم اور عدنان تم دونوں یوں کرو کہ اڑوس پڑوس کے گھروں کے باہر جو پودے لگے ہوئے ہیں۔ انھیں جڑ سے اکھاڑ لاؤ۔ کیونکہ اگر بیج ڈالا یا پنیری لگائی تو عرصہ لگے گا جبکہ جڑوں والے پودے جلد از جلد لگ جائینگے۔"

"مگر وہ نایاب نسل کی چڑیاں کہاں سے آئیں گی؟" باجی نے تشویش کا اظہار کیا تو بھیا بولے "ہم کہیں گے کہ وہ ..... ابو کی جدائی کی وجہ سے مر گئیں۔"

سب نے مل جل کر سارے گھر کی صفائی کی۔ اب صرف میلے کپڑے اور برتن رہ گئے تھے۔ باجی وسیم اور عدنان تو تیار ہوگئے برتنوں اور کپڑوں کی صفائی کرنے کیلئے مگر بھیا نے صاف صاف انکار کر دیا اور بولے یہ کام میرے کرنے کے نہیں ہیں! "تو کیا ہم ماسی ہیں یا دھوبی ہیں؟" وسیم اور عدنان نے برجستہ پوچھا۔ "ویسے بھی میں تو سب سے چھوٹا ہوں اور کمزور بھی، میں یہ کام کر ہی نہیں سکتا۔" وسیم نے بھی بھیا کی دیکھا دیکھی صفائی سے انکار کر دیا۔

"بھیا.....! ابو کے جانے کے بعد اب تک سارے کام ہم تینوں نے ہی کئے ہیں آپ نے صرف حکم چلایا ہے۔" باجی نے ناراضگی سے کہا۔

"میں تم سب سے بڑا ہوں۔ یوں سمجھ لو اس چھوٹی سلطنت کا حکمران ہوں اور حکمران تو حکم ہی چلایا کرتے ہیں۔ ویسے بھی تم لوگ مجھے اپنا رہنما تسلیم کر چکے ہو۔" بھیا نے شاہانہ انداز میں کہا۔

"تو کیا ..... رہنما خود کام نہیں کرتے؟ رسول اللہؐ دنیا کے سب سے عظیم رہنما ہیں۔ وہ تو ہر کام خود اپنے ہاتھوں سے کیا کرتے تھے۔ تو آپ کیا چیز ہیں؟" ..... وکی بھیا خاموش ہوگئے۔ "اچھا چلو بعد میں کرو نگا تم لوگ بھی دو چار دنوں تک آرام کر لو، اسکے بعد سوچا جائیگا۔" بھیا نے ٹال مٹول سے کام لیا۔

"میں اکیلی ہی سارے کچن کی اور برتنوں کی صفائی کر لیتی ہوں۔" باجی نے کچن کا رخ کرتے ہوئے کہا۔

ٹنٹن..... ٹنٹن..... شام کے وقت کال بیل بج اٹھی۔ وسیم نے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا اور

خوشی سے چلانے لگا۔ "ابو آگئے ابو آگئے" بھیا باجی، عدنان، سب ایک ساتھ گیٹ کی جانب دوڑے۔

"ارے..... امی، ابو..... اتنی جلدی.....؟"

"جلدی کہاں بھئی..... چالیسواں کر کے آئے ہیں۔ مگر..... یہ گھر کا کیا حال ہے؟" امی نے ناگواری سے چاروں جانب نظر دوڑاتے ہوئے پوچھا۔

"وہ..... دراصل امی! آج ہم ہفتہ صفائی منا رہے ہیں نا..... اس لئے سب کچھ پھیلا ہوا ہے" بھیا نے کرسی امی کے قریب کرتے ہوئے کہا۔

وسیم بولا، "ابو ابو..... آپ کا چہیتا مرغا۔"

"کیا ہوا مرغے کو؟" ابو نے مرغے کے ذکر پر فوراً سوال کیا۔ جواباً سب خاموش رہے، لہٰذا وہ خود ہی اٹھے اور ڈربے کی جانب چل دیئے۔ بھیا نے خود ہی بتانا شروع کر دیا "ابو وہ بہت خطرناک مرغا تھا۔ اس نے وسیم کو چونچ مار کر زخمی کر دیا تھا۔" "وسیم انکے ڈربے میں گھسا کیوں تھا؟" ابو نے غصے سے پوچھا۔

"وسیم گھسا نہیں تھا بلکہ مرغا کھل گیا تھا اور پڑوسی کے گھر بھاگ گیا تھا۔" بھیا نے وضاحت کی۔ "ارے..... ! یہ پودے کس نے نوچ ڈالے؟"

"یہ بھی مرغے مرغیوں نے مل کر کیا ہے۔" بھیا نے ڈرتے ڈرتے بولے۔

"نالائق..... اپنی غلطی تسلیم کرنے کے بجائے جانوروں پر الزام لگاتا ہے۔" ابو ڈانٹ رہے تھے۔

چڑیوں کی موت سے لیکر وسیم کی بیماری، مرغے کی قربانی، کیاریوں کی ویرانی اور بھیا کی ناکام حکمرانی کی ایک ایک بات وسیم، عدنان اور باجی نے ابو کی عدالت میں بیان کی۔ غصے سے ابو کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

"نالائق..... گھر کا یہ حال ہے اور فون پر مجھے سب ٹھیک ہے، سب ٹھیک ہے کہتا رہا۔ کیا خیال تھا میں واپس آکر کچھ نہ پوچھوں گا؟"

"ابو وہ"..... بھیا منمنائے۔

"کیا وہ وہ"..... ابو چلائے۔

"اگر تمہیں اپنی ذمہ داریوں کا ذرا بھی احساس اور جواب طلبی کا خوف ہوتا تو آج گھر کا یہ حال نہ ہوتا۔ اب تمہیں اس کی سخت سزا ملے گی، سارے کام تم اکیلے کرو گے، کوئی تمہارا ہاتھ نہیں بٹائے گا..... سمجھے۔ نا اہل لوگ جب سربراہ بن جائیں تو گھر کا یہی حال ہوتا ہے۔" ابو نے سزا سنانے کے بعد بھیا کی جانب دیکھتے ہوئے ناراضگی سے کہا۔

جبکہ بھیا سر جھکائے ایسے کھڑے تھے جیسے سوچ رہے ہوں کہ کاش! امی ابو پھر سے چلے جائیں تو وہ کامیابی سے گھر کا انتظام چلا کر خود کو اہل ثابت کر دیں۔ مگر اب یہ سب سوچنے کا کوئی فائدہ نہ تھا۔ کیونکہ وقت تو گزر چکا تھا۔

کرشمہ

آخری قسط

اظہر نیاز

جواد، ذیشان کا دوست تھا۔ وہ حیرت انگیز صلاحیت کا مالک تھا جسے ذیشان کے ابو آغا عمران نے چھٹی حس کا نام دیا تھا۔ جواد کو آنے والے خطرات کا پہلے سے علم ہو جاتا تھا اور اس حس کا مظاہرہ وہ اکثر کرتا رہتا تھا۔ آغا عمران پولیس افسر تھے۔ جواد نے کئی کیسوں میں ان کی بھرپور مدد کی تھی۔ جواد کو ٹی وی ڈراموں میں کام کرنے کا بہت شوق تھا۔ آغا عمران نے اپنے ایک دوست پروڈیوسر انصاری صاحب سے سفارش کر کے جواد کو ڈراموں میں کام کرنے کا موقع فراہم کر دیا۔ انصاری صاحب بھی جواد کی پراسرار قوت سے بہت متاثر ہوئے ریہرسل کے دوران جواد کی ملاقات مس نائلہ سے ہوئی جو شہر کے ایک بااثر شخص کی بیٹی تھی۔ آغا عمران اور انسپکٹر شعیب کا خیال تھا کہ نائلہ کا باپ، سخی بٹ منشیات کے کاروبار میں ملوث ہے مگر ان کے پاس اس بات کا کوئی ثبوت نہیں تھا۔ انسپکٹر شعیب مسلسل سخی بٹ پر نظر رکھے ہوئے تھے۔ دوسری طرف چند پراسرار سے لوگ مسلسل جواد کے تعاقب میں تھے۔ وہ سر راہ اسے روک کر راستہ پوچھتے اور اس کے خلاف عمل کر کے جواد کی پیشین گوئیوں کا امتحان کرتے جو اکثر صحیح ثابت ہوتیں۔ پولیس ان افراد کی نگرانی کر رہی تھی جن کے بارے میں شک تھا کہ وہ سخی بٹ کے آدمی ہو سکتے ہیں۔ ایک دن جواد اور اس کی چھوٹی بہن گڑیا اپنی سائیکلوں پر شام کی سیر کے لئے نکلے تو چند مشکوک افراد نے انہیں اغوا کر کے ایک محل نما عمارت میں پہنچا

دیا۔ محل کے مالک کا نام پرنس احسن تھا۔

ذیشان اور اجلال، جواد کی تلاش میں سرگرداں تھے وہ شیدا پستول سے بھی ملے اور وہیں سے انہیں ایک پرچہ ملا جس پر کوڈ ورڈز میں ایک ٹیلی فون نمبر لکھا ہوا تھا۔ اجلال نے بڑی محنت سے اسے ڈی کوڈ کیا۔ مگر اس نمبر پر ایک پٹھان چوکیدار کے علاوہ کسی سے بات نہ ہو سکی۔ اسی دوران میں آغا عمران گھر میں داخل ہوئے اور انہوں نے بتایا کہ جس مجرم کو انسپکٹر شعیب نے بڑی محنت سے گرفتار کیا تھا کسی نے حوالات کے اندر اسے قتل کر دیا ہے۔

پرنس احسن نے بالآخر جواد کو بڑی مشکل سے اپنے لئے کام کرنے پر راضی کر لیا۔ جواد نے اپنی چھٹی حس کی بدولت پرنس احسن کا لاکھوں روپوں کا مال باآسانی نکلوا دیا لیکن ذیشان نے اپنی ذہانت سے معلوم کر لیا کہ جواد پرنس احسن کے قبضے میں ہے اور اس کے لئے کام کر رہا ہے۔ ادھر جواد اپنی بہن گڑیا کے ساتھ پرنس احسن کے محل نما ٹھکانے سے سخت جدوجہد کے بعد فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا لیکن ایک ٹرک ڈرائیور سے لفٹ لینے کے چکر میں پکڑا گیا۔ ٹرک ڈرائیور نے رومال سونگھا کر جواد اور گڑیا کو بے ہوش کر دیا اور تیزی کے ساتھ ٹرک چلا کر شیشے والے موڑ کی طرف چل پڑا۔ اسی اثناء میں ایک بس ٹرک کے قریب سے گزری۔ اس میں ذیشان اور اجلال بیٹھے ہوئے تھے انہوں نے جواد اور گڑیا کو ٹرک میں چادر میں لپٹا دیکھ لیا۔

ٹرک آگے جا کر شیشے والے موڑ پر رکا۔ ایک خطرناک شکل و صورت والا آدمی جواد اور گڑیا کو لینے کے لئے جھاڑیوں سے برآمد ہوا مگر اس سے پہلے ہی اچانک وہاں پہنچنے والی جیپوں سے گولیاں برسنے لگیں اور ڈرائیور، کلینر اور خطرناک آدمی موت کے منہ میں چلے گئے۔ جواد اور گڑیا اب دوبارہ اسمگلروں کی قید میں تھے۔ پولیس جائے حادثہ پر پہنچی دیگر مسافروں کے ساتھ ذیشان اور اجلال بھی وہاں موجود تھے۔ پولیس نے آوارہ گردی کے شبہ میں ان دونوں کو گرفتار کر لیا اور حوالات لے گئی جہاں انسپکٹر شیدا پستول کی وجہ سے وہ دونوں رہائی حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے۔ حادثے کی جگہ سے ذیشان کو جواد کا رومال ملا تھا جس پر ایک نقشہ بنا ہوا تھا۔ آغا عمران نے اس نقشے کی مدد سے محل پر چھاپہ مارا مگر ناکام رہے۔ جواد نے مجبوراً اسمگلروں کے لئے کام کرنے کی ہامی بھر لی۔ ادھر مس نائلہ نے ذیشان کو فون پر اطلاع دی کہ وہ اسے ایک اہم خبر دینا چاہتی ہے۔

ذیشان نے نائلہ کو اپنے ہی گھر بلوا لیا۔ نائلہ نے اسے ایک انٹرنیشنل اسکول کے بارے میں بتایا جسے چند غیر ملکی چلا رہے تھے، اس اسکول کے پرنسپل نے والدین کو بلا کر بچوں کو چند مخصوص برانڈ کی غیر ملکی ٹافیاں استعمال سے دور رکھنے کی ہدایت کی۔ ذیشان نے وہ ٹافیاں نائلہ سے لے کر آغا عمران کو دے دیں مگر انسپکٹر شعیب اس کہانی پر اعتبار کرنے کے لئے تیار نہیں تھے۔ دوسری طرف جواد نے کسی نہ کسی طرح ایک خط ذیشان تک پہنچا دیا جس کی مدد سے ایک کوٹھی پر چھاپا مارا گیا مگر چھاپا ناکام رہا اور مجرم پہلے ہی فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے۔ یہ سب کام دراصل ڈی ایس پی علی اکبر کی غداری کی وجہ سے ہو رہا تھا۔ وہ پرنس احسن سے ملا ہوا تھا اور اسی نے آغا عمران تک خط پہنچانے والے ڈاکیے کو قتل کر دیا تھا۔ جب ڈی ایس پی علی اکبر نئے چھاپے کی پیشگی اطلاع دینے کے لئے پرنس احسن سے ملا تو جواد نے جو کہ موقع پر موجود تھا ایک ٹکٹ چالاکی سے اکبر کے کپڑوں پر چپکا دیا۔ نئی اطلاع کی روشنی میں پرنس احسن نے آغا عمران کے قتل کا حکم صادر فرما دیا تھا۔

پرنس احسن سے ملنے کے بعد ڈی ایس پی علی اکبر آغا عمران کو رپورٹ دینے کے لئے ان کے گھر آیا تو ذیشان

اس کے لباس سے جواد کا لگایا ہوا انکٹ الگ کر لیا۔ اور پھر ذیشان ہی کے مشورے سے ڈی ایس پی علی اکبر کی نگرانی کرا کے عمران نے اسے موقع پر گرفتار کر لیا۔ ڈی ایس پی علی اکبر نے اپنے تمام جرائم کا اعتراف کر لیا۔ آغا عمران نے مشق پر کام کرنے والے تمام پولیس آفیسرز کی میٹنگ بلا کر انہیں تازہ صورت حال سے آگاہ کیا اور نئے ٹارگٹ ے۔ ادھر مس نائلہ اپنے والد بجی بٹ کی اس اطلاع پر سخت پریشان تھی کہ آغا عمران کی جیپ کو حادثہ پیش آگیا ۔ اسے اس بات پر یقین نہیں آرہا تھا مگر اگلے دن کے اخبارات نے اس خبر کی تصدیق کر دی تھی۔

اب آپ۔ آگے پڑھئے

معلوم نہیں کیا بات تھی کہ اسمگلروں کے اڈے ت ہلچل مچی ہوئی تھی۔ ہر تھوڑی دیر بعد کوئی اک شکل والا آدمی نمودار ہوتا اور کسی کے کان جاکر کچھ کہتا، اور پھر چھلاوے کی طرح غائب اتا۔

"کیا ایسا تو نہیں کہ پرنس احسن ہمیں چھوڑ کر سے فرار ہو گیا ہو؟" ایک آنے والے نے رے سے کہا "نہیں یہ نہیں ہو سکتا۔" دوسرا ں غرایا۔

"نمبر ۲ موجود ہے۔ چلو چل کر اس سے ے ہیں۔ یہ نہ ہو ہم سب چوہوں کی طرح پکڑ جائیں۔" وہ دونوں نمبر ۲ کے پاس پہنچے تو جواد اور اس کی بہن گڑیا پہلے سے موجود ۔

"دیکھیں سر! ہمارے لئے اب آپ سے ن ممکن نہیں رہا۔" جواد کہہ رہا تھا، "کیونکہ ں تعلیم کا حرج ہو رہا ہے، اور ہم پڑھنا چاہتے ۔ ہمارے امتحان شروع ہونے میں صرف ایک رہ گیا ہے۔ اگر آپ ہمیں چھوڑ دیں تو ہم کرتے ہیں کہ آپ کو جب بھی ضرورت ہوگی اور آپ ہم سے جو پوچھیں گے، ہم آپ کو بتا دیا کریں گے۔"

نمبر ۲ کے خوفناک قہقہہ سے سارا ماحول آلودہ ہو گیا۔ اس نے ایک مسلح شخص کی طرف اشارہ کیا ...... "انہیں لے جاؤ اور جا کر بند کر دو اور پہرہ سخت کر دو۔"

ان کو واپس ان کے کمرے میں لے جانے والا وہی شخص تھا جس نے ان کا خط پوسٹ کیا تھا۔ اس نے رستے میں چپکے سے ان کے کان میں کہا۔

"رات کو انتظار کیجئے گا، میں آپ کے پاس آؤں گا اور آپ کو ایک اہم خبر سناؤں گا۔"

رات میں وہ شخص ان کے پاس آیا اور کہنے لگا کہ میرا نام مرزا احمد بیگ ہے۔ نمبروں کی اس دنیا میں، میں اپنا نام بالکل ہی بھول گیا تھا۔ تمہاری باتیں سن کر مجھے اپنے بچے یاد آئے اور اپنا نام بھی۔ تم پڑھنا چاہتے ہو۔ تمہارے عمر کی میری بھی ایک بیٹی ہے۔ میں چاہتا ہوں وہ پڑھے، کوئی باعزت پیشہ اختیار کرے لیکن میں ان لوگوں میں پھنس گیا۔ بچوں پر توجہ نہیں دے سکا۔ گھر بھی چھپ کر جاتا

معززین شہر، قومی و صوبائی اسمبلی کے ممبران، پولیس کے اعلیٰ افسران جلسے میں شریک تھے۔ ایک وزیر مملکت مہمان خصوصی تھے اور صدارت جناب سخی بٹ کر رہے تھے۔ جن کا شمار شہر کی معروف سماجی شخصیات میں ہوتا تھا۔ آغا عمران کو خراج عقیدت پیش کیا جارہا تھا۔ اُن کی قومی خدمات کو سراہا جارہا تھا۔ آغا صاحب کی قد آدم تصویر جلسے کے پس منظر میں مسکرا رہی تھی۔

اتنے میں پرنس احسن ریفرنس ہال میں داخل ہوا۔ وہ معمول کی شہزادوں والی یونیفارم کی بجائے عوامی سوٹ میں ملبوس تھا۔ میک اپ سے اس نے اپنے آپ کو چھپانے کا خاص اہتمام کیا تھا۔ چہرے پر خاص اسٹائل کی مونچھیں تھیں جنہوں نے اس کے اوپر والے ہونٹ کو بالکل چھپالیا تھا۔ کچھ لوگوں نے اس کی طرف دیکھا اور پھر تقریر سننے لگے۔ اتنے میں آغا عمران جو خود میک اپ میں تھے، ریفرنس ہال میں داخل ہوئے اور چپکے سے پرنس احسن کی ساتھ والی کرسی پر بیٹھ گئے۔ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور پھر تقریر سننے لگے۔ ایک اور پولیس آفیسر ہال میں داخل ہوا۔ اس کے داخل ہوتے ہی پرنس احسن کے دائیں طرف والا آدمی اٹھ گیا۔ اور پولیس والا خالی جگہ پر آکر بیٹھ گیا۔ پھر اسی طرح ایک پولیس والا پرنس احسن کی آگے والی کرسی پر آکر بیٹھ گیا۔ پھر پرنس احسن کی پیچھے والی سیٹ سے آدمی اٹھا اور اس کی جگہ پولیس والا آکر بیٹھ گیا۔

آغا عمران کی تعریف میں تقریریں جاری تھیں۔ تالیاں بج رہی تھیں۔ ایک ایک آدمی اٹھتا جاتا تھا اور پولیس والا بیٹھتا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ پرنس احسن کے چاروں طرف صرف پولیس والے بیٹھے تھے۔ پرنس احسن نے نظریں بچا کر چاروں طرف دیکھا اور اٹھنے لگا..... آغا عمران نے انہیں ہاتھ سے پکڑ کر بٹھالیا..... "بری بات ہے تقریب کے درمیان سے نہیں اٹھتے، چائے پی کر ہی چلیں گے۔" آغا عمران نے کہا۔

پرنس احسن نے خطرے کی بو سونگھ لی تھی لیکن اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ پولیس افسران نے پستول ہاتھوں میں لے لئے تھے۔ آغا عمران نے پرنس احسن کو ہتھکڑی پہنادی اور اسے پولیس کے جلو میں لیے اسٹیج کی طرف چل پڑے۔

"یہ کیا ہو رہا ہے؟" اسٹیج سیکرٹری نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔ آغا عمران کی تعریف میں تقریر کرنے والا مقرر اس دخل اندازی پر آغا عمران کو بڑی گہری نظروں سے گھور رہا تھا۔ آغا عمران نے اسٹیج پر پہنچ کر اپنا میک اپ اتار دیا۔

"آغا عمران!!....." پورے ہال میں ایک آواز گونجی۔

"جی..... آپ کا خادم آغا عمران..... اور یہ ہے وہ شخص پرنس احسن، جس نے مجھے مروانے کی سازش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکا۔" یہ کہتے ہوئے آغا عمران نے پرنس احسن کا میک اپ بھی اتار دیا۔

دوسرے ہی لمحے وہ سارا اجلاس جو آغا عمران کی یاد میں ہو رہا تھا۔ پریس کانفرنس میں تبدیل ہو گیا۔ صحافیوں کے ساتھ ساتھ پولیس افسران بھی سوال کرنے والوں میں شریک ہو گئے۔ آغا عمران نے تفصیل بتاتے ہوئے کہا:

"کہانی یہ ہے کہ سخی بٹ صاحب جو آج کے جلسے کے صاحب صدر ہیں اور پرنس احسن جو آج کے ملزم اوّل ہیں، ایک ہی گاؤں کے رہنے والے ہیں۔ دونوں دوست تھے اور روزگار کی تلاش میں شہر آئے تھے۔ دونوں نے محنت کی اور دولت کمائی۔ دونوں کے نظریات میں فرق تھا۔ پرنس احسن ہر جائز و ناجائز ذریعہ سے دولت کمانا چاہتا تھا جبکہ سخی بٹ صرف ایمان دارانہ طریقے سے دولت کے حصول پر یقین رکھتے تھے۔ پرنس احسن نے اسمگلنگ شروع کر دی اور سخی بٹ صاحب پراپرٹی کا کاروبار کرنے لگے۔ دونوں میں اختلافات ہوئے اور دونوں نے اپنے راستے جدا کر لئے۔ گزشتہ دس برسوں میں یہ لوگ آپس میں ملتے جلتے بھی نہیں تھے۔ پرنس احسن کی کوشش یہ ہوتی کہ ہر بُرا کام جو وہ خود کرتا اس میں سخی بٹ کو ملوث کرنے کی کوشش کرتا، تاکہ اس کے جرائم بٹ صاحب کے کھاتے میں چلے جائیں۔ اسی طرح وہ کوٹھی جس میں اس نے اپنا اڈا بنا رکھا تھا، سخی بٹ کے نام تھی۔ ہمارے اکثر پولیس والے سخی بٹ صاحب کو مشکوک سمجھتے تھے، لیکن کوئی ثبوت نہ ہونے کی وجہ سے وہ بٹ صاحب پر ہاتھ نہیں ڈال سکتے تھے۔

بچوں کی کھانے پینے کی اشیا میں نشہ آور ادویات کی ملاوٹ سے جو مسئلہ پیدا ہوا تو سخی بٹ کا نام پھر سامنے آیا لیکن پتہ چلا کہ اصل مجرم کوئی اور ہے اور اس طرح پولیس پرنس احسن تک پہنچ پائی۔

مجھے شرمندگی ہے کہ پولیس میں بھی چند کالی بھیڑیں تھیں۔ جن کی وجہ سے یہ کاروبار اتنے عرصے تک چلتا رہا۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ اسکولوں کے باہر کھڑی ہونے والی ریڑھیوں سے پولیس والے روزانہ بھتہ وصول کرتے تھے۔ گلیوں میں چل پھر کر روزی کمانے والوں سے بھی پولیس بھتہ وصول کرتی تھی۔ اس سے دو نقصان ہوئے۔ ایک تو مجرم پکڑے نہیں جاتے تھے اور دوسرے غریب مزدور، ریڑھی والے اپنی دن بھر کی کمائی کا بیشتر حصہ ان بے ایمان پولیس والوں کو دے جاتے تھے۔

اس سلسلے میں، میں نے چند سفارشات تیار کی ہیں جو جناب ایس ایس پی راؤ اقبال صاحب کو پیش کر دی گئی ہیں تاکہ ان پر عملدر آمد سے اس جرم کا تدارک کیا جا سکے۔

مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ پرنس احسن کے پیچھے اور بھی بااثر لوگ موجود ہیں۔ امید ہے چند دنوں تک وہ لوگ بھی سلاخوں کے پیچھے ہوں گے۔

ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے آغا عمران نے کہا کہ آپ نے جواد اور گڑیا کے بارے میں پوچھا ہے، تو ہم انہیں بہ حفاظت نکال لائے تھے۔ اس

کر رہا ہوں کہ آج ہی شہر چھوڑ کر دوسرے شہر جا رہا ہوں۔ آپ کو ہوٹل ہی سے ہمارا پتہ چل جائے گا کہ ہم کہاں ہیں..... گڈ لک....." اور نمبر ۲ نے فون بند کر دیا۔

خاموشی رات کو اور خوفناک بنا رہی تھی، کہیں کہیں کوئی آواز..... کسی کے بولنے کی، کسی کے چلنے کی، ماحول کو پراسرار بنا دیتی۔ اتنے میں جواد اور گڑیا کو کمرے کے دروازے میں چابی گھمانے کی آواز آئی۔ دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور ڈر سے سمٹ گئے۔ دروازہ آہستہ سے کھلا اور اندھیرے سے ایک سایہ سامنے آگیا۔

وہ مرزا احمد بیگ تھا۔

اس نے دونوں کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور ..... دروازہ بند کر دیا۔ "میں نے تمام انتظامات مکمل کر لئے ہیں۔ ذرا فاصلے پر ایک کار بھی تیار ہے۔ اگر خدانخواستہ مجھے کچھ ہو جائے تو آپ گیٹ سے باہر نکل کر بائیں طرف بھاگئے گا۔ آپ کو کار مل جائے گی۔ گیٹ کے پاس بیٹھا ہوا، چوکیدار بے ہوش ہے اور چھوٹی کھڑکی کھلی ہے۔ میں آپ لوگوں کے کمرے کا دروازہ کھلا چھوڑ کر باہر جاؤں گا۔ ایک مرتبہ پھر سیکورٹی کے تمام انتظامات کا جائزہ لیتا ہوں اور اگر میں نے مناسب سمجھا تو آپ کو دروازے کے سامنے جو راہداری ہے، اس کے دوسرے کونے سے اشارہ کروں گا۔ آپ لوگ اپنے دروازے کو ذرا سا کھول کر دیکھتے رہیں۔ میرا اشارہ ملتے ہی میری طرف آئیے گا۔ بھاگئے گا نہیں..... بہت آہستہ سے..... قدموں کی آواز بالکل بھی نہیں..... ٹھیک؟"

دونوں نے اپنا سر ہلایا کہ وہ سب سمجھ گئے ہیں۔

مرزا اٹھا اور دروازہ کھلا چھوڑ گیا۔ چند ہی لمحوں بعد اس نے راہداری کی دوسری طرف سے اشارہ کیا۔ گڑیا اور جواد آہستہ سے کمرے سے نکلے اور بلی کی طرح چلتے ہوئے اس تک پہنچ گئے۔ اس نے ان کو وہیں روکا اور خود ایک موڑ مڑا..... جونہی وہ مڑا..... ایک چیخ سنائی دی۔ جیسے کسی نے اس کو دبوچ لیا ہو۔ اور اس کی چیخ اس کے گلے میں پھنس گئی ہو۔ ابھی جواد اور گڑیا کی سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کریں کہ کسی نے ان کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ اندھیرے میں انہیں کچھ پتہ نہیں چلا کہ کیا ہو گیا۔ گڑیا بے ہوش ہو گئی تھی۔ خوف سے جواد کا بھی بُرا حال تھا لیکن وہ اپنے حواس پر قابو پانے کی کوشش کر رہا تھا۔ چاروں طرف سے گولیوں کی آوازوں نے اس کا دل دہلا دیا تھا۔ چلتے ہوئے اس کے پاؤں کسی دوسرے گرے ہوئے آدمی کے پاؤں سے ٹکرائے تو جواد کے پورے جسم میں بجلی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ گرا ہوا شخص غالباً ان کا وہی ہمدرد تھا۔ مرزا احمد بیگ ..... جس کی چیخ انہوں نے ابھی سنی تھی اور اب وہ فرش پر لاش کی صورت پڑا تھا۔

○ ..... ○ ..... ○ ..... ○

ہوٹل میں آغا عمران کا تعزیتی جلسہ جاری تھا۔

ہوں۔ وہ بھی سال میں ایک آدھ دفعہ ..... خیر ..... اس نے دوسری طرف منہ کر کے اپنی آنکھیں پونچھیں۔

"میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ نمبر ۲ نے مجھے آغا عمران کو قتل کرنے کا کام سونپا تھا۔"

"پھر! ؟؟ " دونوں بچوں نے بیک وقت پوچھا تھا۔

"آج کے اخبار میں یہ خبر چھپی ہے۔" مرزا احمد بیگ نے کہا "آغا عمران کی جیپ کو حادثہ پیش آگیا۔ اور وہ اس حادثے میں موت کا شکار ہو گئے۔"

"تو کیا یہ تم نے.....؟" جواد نے پوچھا۔

"آہستہ آہستہ....." اس نے جواد کے منہ پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "میں نے انہیں یہی بتایا ہے لیکن بات یہ ہے کہ میں آغا عمران کے پاس چلا گیا تھا اور انہیں سب کچھ بتا دیا تھا اور ان ہی کے کہنے پر میں نے واپس آکر ان لوگوں کو حادثے کی خوشخبری سنائی۔ یہ سارا پولیس کا پلان تھا تاکہ زیادہ سے زیادہ مجرموں کو گرفتار کیا جا سکے اور خاص طور پر پرنس احسن جو ملک سے باہر چلا گیا ہے، واپس آجائے۔"

جواد عجیب خوشی اور حیرت میں ڈوبا ہوا تھا۔

مرزا احمد بیگ اٹھتے ہوئے کہنے لگا، "اس جگہ پر آخری ایکشن سے پہلے میں آپ کو بتا دوں گا۔ اور ہم کوئی ایسا پروگرام بنائیں گے کہ یہاں سے نکل چلیں۔ کیونکہ پولیس مقابلے کا خطرہ ہے۔ اور ہاں

..... آخری ایکشن سے پہلے آپ وہی کچھ کر
رہیں جو یہ لوگ چاہتے ہیں۔"

○ ..... ○ ..... ○ ..... ○

"ہیلو پرنس احسن آپ کے لئے خوش
ہے۔"

نمبر ۲ زور زور سے چیخ رہا تھا، اور ٹیلی فو
بیرون ملک پرنس احسن سے بات کر رہا تھا۔
ہاں ہمارے آدمی نے وہ کام کر دکھایا جس کا
کو شدت سے انتظار تھا۔ اب آپ پروگرام
مطابق واپس پاکستان آسکتے ہیں۔ جی ہاں
پورٹ سے سیدھے اسلام آباد ہوٹل .....
پورٹ پر نمبر ۷ آپ کے لئے موجود ہو گا۔
کام کا ماہر ہے۔"

"جی ہاں، شہر کی ایک معروف تنظیم سے
دیا گیا ہے، غضنفر مہدی صاحب سے بات
ہے۔ مہدی صاحب تعزیتی جلسہ کرانے کے
ہیں، ایک مرتبہ توانہوں نے ایک زندہ شاعر کا
جلسہ کرا دیا تھا۔" نمبر ۲ ہنسا چاہتا تھا لیکن د
طرف سے فقرے کی داد نہ پا کر خاموش ہو
"جی ..... تمام اخراجات کے پیسے میر
انہیں نمبر ۳ کے ذریعے ایڈوانس دے
ہیں۔"

"سر!، سخی بٹ صاحب نے صدارت کی
بھر لی ہے ..... جی مہدی صاحب نے ہی ان
رابطہ کیا تھا۔ سر، ہم لوگ تو حاضرین میں بھی
ہوں گے۔ آپ بالکل فکر نہ کریں۔ بلکہ میں

پورے کھیل میں ایک سلطانی گواہ مرزا احمد بیگ کا اہم کردار ہے۔ جس کے ذمہ میرا قتل لگایا گیا تھا، اور وہ ہم تک پہنچ گیا۔ وہی شخص جواد اور گڑیا کو مجرموں کے اڈے سے نکال لانے میں کامیاب ہوا۔ جواد اور گڑیا کو پولیس کی نگرانی میں چھاپہ مار کر بر آمد کیا گیا۔ پولیس مقابلے میں صرف ایک مجرم مارا گیا۔ مرزا احمد بیگ ہماری حراست میں ہے اور وہ ایک اہم گواہ ہے۔

آخر میں، میں ان تمام لوگوں کا شکریہ ادا کرتا ہوں جنہوں نے اس آپریشن میں ہماری مدد کی، جس میں عوام اور پولیس والے دونوں شامل ہیں اور خاص طور پر صحافی جنہوں نے اس کیس کو خواہ مخواہ ابھارنے کے بجائے صحیح صحیح رپورٹنگ کی۔

اگر اب بھی کوئی سوال آپ کے ذہن میں ہو تو میں حاضر ہوں۔ کوئی بھی شخص مجھ سے براہ راست یا خط لکھ کر اس کیس کی کوئی بھی تفصیل جان سکتا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ ہر پاکستانی کا قانونی حق ہے۔

"اٹھئے پرنس احسن.....؟" جیل کی کال کوٹھری آپ کا انتظار کر رہی ہے۔" پرنس احسن جو مہمان خصوصی اور آغا عمران کی درمیانی کرسی پر بیٹھا تھا..... مر چکا تھا۔

آغا عمران نے ہتھکڑی کھول دی اور لاش پوسٹ مارٹم کے لئے بھجوا دی۔

آغا عمران سوچ رہے تھے۔"پرنس احسن کو کیا ہوا؟

کیا وہ خوف سے مر گیا؟

یا اسے قتل کر دیا گیا؟

تاکہ ہم اصل چہرے بے نقاب نہ کر سکیں۔"

یاد رکھنے کی باتیں

جب بڑھاپا آجائے، تنہائی مقدر بن جائے، امید کی شمع مدھم ہو جائے، مسکرانے کی عادت چھوٹ جائے، طاقت باقی نہ رہے اور زندگی غموں، دکھوں اور محرومیوں کا میلہ بن جائے تو دنیا کہتی ہے "جا" اور قبر کہتی ہے "آ" (گیتے مین)

تشکر وہ فرض ہے جس کا ادا کرنا ہم سب کے لئے ضروری ہے لیکن ہمیں دوسروں سے اس کی توقع نہیں رکھنی چاہئے۔ (روسو)

انسان کے لئے اس کی زندگی کا ایک ایک لمحہ بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ یہ انسان کا مقدر اور اس کی شان ہے کہ وہ زندگی کی تمام پریشانیوں اور الجھنوں کے چیلنج کو قبول کر کے ہنسی خوشی زندہ رہنے کا حوصلہ پیدا کرے۔ (کاہیو)

مت بھولو کہ وہ رقم جو تم کسی مستحق کے ہاتھ پر رکھتے ہو۔ جو تمہاری جانب پھیلایا گیا ہے تو وہ نیکی ایک ایسی سنہری زنجیر ہے جو تمہارے دل کو مہربان خدا سے ملاتی ہے۔ (جبران)

لوگ اور کوئی چیز اتنی فیاضی سے نہیں دیتے جتنا مشورہ۔ مشورے تو ہم سب لیتے ہیں لیکن صرف عقلمند ان سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ (فوکالڈ)

مرسلہ ساجد کمالوی، کمالیہ

چیزوں کی کہانی

چولہا

آصف فرّخی

بعض لوگ بہت جلتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ جلنا ان کی فطرت ہے۔ ایسے "جل کمڑوں" کو کوئی پسند نہیں کرتا۔ اور نہ ایسے لوگوں کو پسند کیا جاتا ہے جو ذرا ذرا سی بات پر بھڑک اٹھتے ہیں۔ کسی نے کچھ کہہ دیا اور ان کے آگ لگ گئی۔ بھڑک کر شعلہ بن جانے والوں اور جلتے رہنے والوں میں تو بس چولہے کی بات نرالی ہے۔ اس کی آگ سب کو اچھی لگتی ہے۔ کوئی اس پر ہاتھ تاپتا ہے، کوئی اس میں ایندھن جھونکتا ہے اور کوئی اس پر پکنے والے کھانوں کی خوشبو سونگھتا ہے۔ چولہا بھی عجیب چیز ہے۔ خود آگ میں جلتا رہتا ہے کہ ہماری بھوک کی آگ بجھا سکے۔

چولہے کا جلنا گھر بار میں برکت کی نشانی سمجھا جاتا ہے۔ پہلے زمانے میں جس گھر میں چولہا نہیں جلتا تھا تو محلے والے سمجھ جاتے تھے کہ اس گھر کے رہنے والوں پر کوئی مصیبت پڑی ہے جو ان کا چولہا ٹھنڈا ہے۔

چولہے بنانا اور پھر آگ جلانا انسان نے فوراً نہیں سیکھ لیا۔ پہلے چولہا جلانے میں کافی وقت لگا۔

انسان کی ابتدائی دریافت اور ایجادوں میں آگ بہت اہم ہے۔ آگ نہ جلتی تو نہ روشنی ہوتی نہ گرمی۔ آگ نے نامعلوم اندھیروں کو دور بھگا کر انسان کا خوف دور کیا اور دنیا کو اس پر مزید واضح کیا۔ آگ کی مدد سے کھانا پکانا شروع کیا، ورنہ اس سے پہلے انسان صرف وہ کھاتا تھا جو

پکائے بغیر کھایا جاسکتا تھا۔

آگ کی دریافت انسان کی ابتدائی فتوحات میں بہت اہم تھی۔ آگ کی طاقت نے انسان کیلئے بہت سی چیزوں کو ممکن بنا دیا۔ یونان کے پرانے باشندے کہتے تھے کہ اصل میں آگ دیوتاؤں کے پاس رہتی تھی، اور پرومیتھس انسانوں کے لئے آگ چرا کر لایا تھا۔ دیوتاؤں نے اس کو یہ سزا دی کہ ایک عقاب ہر وقت اس کا جگر نوچتا رہتا تھا۔ اس روایت سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ آگ کی دریافت کرنے والا شخص انسانیت کیلئے ہیرو کا سا درجہ رکھتا ہے۔

آگ جلا کر انسان نے ان غاروں کی سردی کو دور کیا جو اس کا پہلا گھر تھے۔ آگ سے جنگلی جانوروں کو دور رکھنے میں بھی مدد ملتی تھی۔ آگ کے گرد بیٹھ کر کھانا کھاتے ہوئے کسی آدمی کے حصے کا گوشت آگ میں گر گیا ہوگا۔ اس نے اٹھا کر کھایا ہوگا تو پتہ چلا ہوگا کہ آگ میں بھن کر اس کا مزہ بہتر ہو گیا ہے۔ یوں پکانے کی ابتدا ہوئی ہوگی۔

کھلی آگ کو تیز ہوا سے بچانے کیلئے ایک خاص جگہ رکھا جاتا اور اس کے چاروں طرف پتھر لگا دیئے جاتے۔ یہ آتش دان بن گیا۔ ہزاروں برس تک یہ آتش دان جس سے چولہے کا کام بھی لیا جاتا، گھر کا مرکز بنا رہا۔ گھر والے اس کے گرد جمع ہو کر بیٹھتے اور کوئی دشمن بھی یہاں پہنچ جاتا تو اس کو مہمان سمجھ کر کھانے میں شریک کر لیا جاتا۔

گرم ملکوں میں آتش دان کی اتنی ضرورت نہیں تھی۔ قدیم مصر اور یونان میں لوگ دھات یا پتھر کے برتنوں میں جلتے ہوئے کوئلے رکھ لیتے۔ انہیں ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانا آسان تھا۔ یہ انگیٹھی کی پہلی شکل تھی۔ گھروں کو گرم رکھنے کی ضرورت نے "روم" کے لوگوں کو بڑا اعلیٰ اور عمدہ انتظام کرنے پر اکسایا۔ یہ طریقہ حمام کو گرم کرنے کیلئے رائج تھا اور امراء کے گھروں میں بھی استعمال ہونے لگا۔ کھوکھلی دیواروں اور فرش

بیسے طرح طرح کے

گاہک..... "ویٹر میرے شوربے میں مکھی ہے"

ویٹر..... "گھبرائیں نہیں جناب یہ زیادہ شوربہ نہیں پیئے گی"

گاہک..... "میرے شوربے میں مردہ مکھی پڑی ہے ویٹر"

ویٹر..... "تو کیا آپ چاہتے ہیں میں اسے زندہ کر دوں"

گاہک..... "ویٹر میری پلیٹ میں ایک مکھی پڑی ہے"

ویٹر..... "غور سے دیکھئے جناب ہم پلیٹ میں تین سے کم مکھیاں ڈالنا بد دیانتی سمجھتے ہیں"

گاہک..... "ویٹر میرے شوربے میں مکھی ہے"

ویٹر..... "جناب کچن میں ڈی ڈی ٹی ختم ہو گیا ہے اس لئے باورچی نے مکھیوں کو ڈبو کر مارنا شروع کر دیا ہے"

کے ذریعے باہر کی آگ کی گرمی کو گھر کے کونے کونے میں پہنچایا جاتا۔ یہ انتظام خاصا جدید ہے۔

پاکستان کے شمالی علاقوں اور گلگت میں، جہاں شدید سردی پڑتی ہے، اب بھی ایسے گھر بنائے جاتے ہیں جن کے بیچ میں آگ جلائی جاتی ہے اور دھوئیں کے ذریعے گرمی حاصل کی جاتی ہے۔

دھوئیں سے بچاؤ کے لئے آتش دان کو گھر کے ایک کونے میں تعمیر کیا جانے لگا۔ یورپ کے محلوں اور قلعوں کے طویل کمروں اور ایوانوں میں بڑے بڑے آتش دان بنائے جاتے۔ تیرہویں صدی کے انگلستان میں پہلا دُودبان، چمنی کی شکل میں سامنے آیا جو سارا دھواں کمرے سے باہر لے جاتا۔

لکڑی اور کوئلے جلا کر آگ اور گرمی حاصل کرنے کے مختلف طریقے آزمائے گئے۔ روس میں ایسے بڑے بڑے چولہے یا اسٹوو رائج تھے جن پر بعد میں سویا جاتا تھا تاکہ ان کی گرمی سے فائدہ اٹھایا جائے۔

جن آتش دانوں کے گرد بیٹھ کر جاڑے کی لمبی لمبی راتوں میں سارے گھر والے اکٹھے ہوتے اور قصے کہانیاں سناتے، وہ اب قصہ پارینہ بن گئے۔ آج کل کے گھروں میں سینٹرل ہیٹنگ سے گرمی پہنچتی ہے۔ پہلے لکڑی اور کوئلہ ایندھن کے طور پر استعمال ہوتے تھے، اب ان کی جگہ تیل، سوئی گیس اور بجلی نے لے لی ہے۔ اور وہ دن دور نہیں جب یہ سارے کام شمسی توانائی سے لئے جائیں گے۔

آتش دان کے ساتھ ساتھ چولہا بھی ترقی کرتا گیا۔

سب سے پہلا چولہا یوں بنا ہو گا کہ زمین پر ذرا سی جگہ صاف کر کے آگ پر کچھ پکنے کو رکھ دیا گیا ہو گا۔ جب برتن استعمال ہونے لگے تو انہیں جلتی آگ پر رکھ کر یا آتش دان پر لٹکا کر ان میں پکایا جانے لگا۔

ایندھن کے مختلف ذرائع کے ساتھ ساتھ چولہوں کی شکلیں بھی بدلتی رہی ہیں۔ ہمارے ہاں پہلے چولہے میں عام طور پر لکڑی جلائی جاتی تھی اور آگ کو بھڑکانے کیلئے پھونکنی سے پھونکیں ماری جاتی تھیں۔ پھر مٹی کے تیل کے چولہے عام ہوگئے۔ یہ چولہے بعض مرتبہ پھٹ جاتے ہیں اور لوگوں کو نقصان بھی پہنچا سکتے ہیں۔

روٹی پکانے کے لئے بہت سے معاشروں میں ایک خاص وضع کا چولہا استعمال ہوتا ہے۔ ہمارے ہاں روٹی تندور میں پکتی ہے۔ تندور سے روٹی خوب سنک کر اور سرخ ہو کر نکلتی ہے۔

گیس اور بجلی نے اب چولہے کی کایا پلٹ دی ہے۔ کھانا پکانا اتنا صبر آزما کام نہیں رہا۔ مائکرو ویو نے کھانے پکانے کو چند لمحوں کی بات بنا دیا ہے۔ چولہا اب بھی جل رہا ہے۔

چرواہا اور لومڑی

امتیاز جلیل

"اف! میں تو بہت تھک گیا ہوں۔" میں نے بستر پر گرتے ہوئے کہا۔

"میرا خیال ہے کہ تھک تو ہم بھی گئے ہیں۔" نوید نے تائید طلب نظروں سے فیصل اور حسن کی طرف دیکھا۔ دونوں کے چہروں سے تھکاوٹ صاف ظاہر تھی۔

"آج گھومے بھی تو خوب ہیں" حسن بولا۔

"مجھے تو رات کے کھانے کی بھوک بالکل نہیں ہے لہٰذا میں تو سو رہا ہوں۔" فیصل نے جوتے اتارتے ہوئے کہا۔ "ہاں بھی! آج گھومتے پھرتے کافی کچھ کھالیا ہے۔ بھوک تو مجھے بھی نہیں ہے۔" میں نے فیصل کی ہاں میں ہاں ملائی۔

"تو ٹھیک ہے! لمبی تان کر سو جاتے ہیں۔ کیوں بھئی نوید؟" "لیکن پہلے کل کا پروگرام تو طے کرلو۔" نوید نے جواباً کہا۔

"کل کی کل دیکھی جائے گی۔ فی الحال سونے کی تیاری کرو۔"

"ذرا دیکھو تو فیصل صاحب گھوڑے بیچ کر سو بھی چکے ہیں۔" میں نے کہا۔

اور پھر کچھ ہی دیر میں سب خوابِ خرگوش کے

مزے لوٹ رہے تھے۔

ان دنوں ہم سوئٹزر لینڈ کی سیر کر رہے تھے۔ امتحانات کے بعد چونکہ ہم فارغ تھے اس لئے چاروں دوستوں نے سیر و تفریح کا یہ پروگرام ترتیب دیا تھا۔

صبح ہماری آنکھ کھلی تو ہلکی ہلکی دھوپ کھڑکی سے چھن چھن کر ہوٹل کے کمرے میں آرہی تھی۔ تھوڑی ہی دیر میں ہم نے نیچے کا رخ کیا تاکہ ناشتے وغیرہ کا کچھ بندوبست کیا جائے۔

ہوٹل کے ریسٹورنٹ میں ہم ابھی ناشتے سے انصاف کر کے فارغ ہوئے ہی تھے کہ برابر کی میز سے اٹھ کر ایک نوجوان کرسی گھسیٹ کر ہمارے قریب آکر بیٹھ گیا۔

"مجھے جوزف کہتے ہیں۔" اس نے انگریزی میں اپنا تعارف کروایا۔

"کیا آپ لوگ یہاں سیر کی غرض سے آئے ہیں؟" اس نے ہم سے سوال کیا۔

"جی ہاں!" نوید نے خوش اخلاقی سے کہا۔

"میں بھی یہاں سیر کی غرض سے جرمنی سے آیا ہوں۔ سنا ہے یہاں نزدیک ہی کوئی بڑی پُر فضا وادی ہے۔ ابھی کل ہی مجھے کچھ سیاح ملے تھے جو وہاں کی سیر کر کے واپس آئے تھے۔ انہوں نے اس جگہ کی تعریف کچھ اس انداز میں کی کہ میں وہاں جانے کے لئے اپنے آپ کو بے تاب پاتا ہوں۔ اب میں ٹھہرا اکیلا۔ اگر ہم پانچوں کا اس سفر کے لئے گروپ بن جائے تو سفر اور سیر دونوں میں آسانی رہے گی۔ کیا خیال ہے؟" اس نے جواب طلب نظروں سے ہماری طرف دیکھا۔

"کیا کہتے ہو؟" فیصل نے حسن سے پوچھا۔

"ان دونوں سے پوچھ لو ویسے میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ جانے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ ہم آئے ہی تفریح کے لئے ہیں۔" حسن نے جواب دیا۔

"تو پھر کل صبح ہی نکل چلو۔ دن میں گھوم پھر لیں گے اور شام تک واپس آجائیں گے۔ کیوں مسٹر جوزف؟" نوید نے سوالیہ نظروں سے جوزف کی طرف دیکھا۔

"بالکل ٹھیک! صبح سویرے ہی نکلنا بہتر رہے گا۔ صبح ۷ بجے یہاں سے ایک بس جاتی ہے اور سفر صرف دو گھنٹے کا ہے، اس لئے ناشتہ وہیں پہنچ کر کر لیں گے۔" جوزف نے جلدی جلدی کہا۔

اور اگلے دن ہم سرسبز و شاداب وادی میں موجود تھے۔ یہ وادی سرسبز اور اونچے اونچے پہاڑوں کے درمیان گھری ہوئی تھی اور پہاڑوں سے ایک دریا بھی نکلتا تھا۔ ہر طرف ہریالی ہی ہریالی تھی۔ پرندے چہچہا رہے تھے۔ کبھی کبھی کوئی خرگوش بھی ادھر ادھر بھاگتا دکھائی دیتا۔

یہاں پہنچنے کے بعد سب سے پہلے ہم نے ناشتہ کا بندوبست کیا اور ناشتے کے بعد مٹرگشت پر روانہ ہو گئے۔ موسم نہایت شاندار تھا اور پوری وادی ایک

بڑا دلکش منظر پیش کر رہی تھی۔

دوپہر تک یونہی گھومتے رہنے کے بعد ہم نے ایک چھوٹے سے ہوٹل میں بیٹھ کر کھانا کھایا اور اس کے بعد پھر باہر نکل آئے۔ سہ پہر کے قریب ایک جگہ ستانے بیٹھ گئے۔ دور کہیں سے ایک بوڑھا آدمی بکریاں چراتا ہوا ہماری جانب آنکلا اور ہمیں بیٹھا دیکھ کر خود بھی ہمارے ساتھ بیٹھ گیا..... شاید وہ بھی ہماری طرح دن بھر کا تھکا ہوا تھا۔

"تم لوگ یہاں گھومنے پھرنے آئے ہو؟" چرواہے نے ہم سے سوال کیا۔

"جی ہاں!" حسن نے جواب دیا۔

"ہوں! آئے تو تم بڑے اچھے موسم میں ہو ورنہ یہاں تو بڑے بڑے طوفان بھی آتے رہتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ برف باری بھی ہوتی ہے۔"

یہ الفاظ کہتے کہتے بوڑھا کچھ اُداس سا ہو گیا۔

"تم کیا جانو..... کبھی کبھی یہ طوفان کس قدر بھیانک ثابت ہوتے ہیں..... آہ! بے چاری لوسی۔"

بوڑھا ہوا میں تکتے ہوئے بولا.....

"کون لوسی؟" بوڑھے کی بات پر جوزف کو تجسس ہوا۔

"سننا چاہتے ہو تو سنو!" بوڑھا پھر گویا ہوا۔

"یہیں اسی وادی میں ایک بڑی خوبصورت اور

عجیب چارپائی

شہر ڈیرہ غازی خان میں ایک چارپائی تھی جس میں تقریباً ڈیڑھ سو آدمی ایک ساتھ بیٹھ سکتے تھے

مرسلہ انعام الحق مون، لاہور

پیاری پھول جیسی بچی رہا کرتی تھی۔ اس کا نام وِن گرے تھا۔ لوسی اور اس کے ماں باپ اپنے چھوٹے سے گھر میں اکیلے رہتے تھے۔ اس وقت یہ وادی تقریباً غیر آباد سی تھی اور یہی وجہ تھی کہ لوسی کے دوستوں میں بجائے اپنے جیسے بچوں کے ہرن کے بچے تھے۔ سارا دن لوسی اور ہرن کے بچے کھیلتے کودتے رہتے۔ دن یونہی خوشی سے گزر رہے تھے کہ اچانک لوسی اور اس کے والدین کی بدنصیبی کے دن شروع ہو گئے۔

ہوا یوں کہ ایک دن لوسی کی ماں سودا سلف لینے شہر گئی ہوئی تھی کہ اچانک موسم نے جو صبح تک بڑا خوشگوار تھا رنگ بدلنا شروع کر دیا۔ "یوں لگتا ہے جیسے زبردست طوفان آنے والا ہے برف باری کے بھی آثار لگتے ہیں۔" لوسی کے باپ نے پریشانی کے عالم میں لوسی سے کہا۔

"تم یوں کرو کہ لالٹین لے کر شہر کی طرف چلی جاؤ۔ راستے میں تمہیں تمہاری ماں مل جائے گی۔ لالٹین کی وجہ سے تم دونوں کو واپس آنے میں آسانی رہے گی" ..... لوسی کے باپ نے مزید کہا۔

اور پھر دن کے دو بجے لوسی نے لالٹین تھامی

اور خوشی خوشی اپنی منزل کی جانب رواں دواں ہوگئی۔ طوفان کی آمد آمد تھی اور برف باری شروع ہو چکی تھی۔ برف روئی کے گالوں کی طرح گر رہی تھی اور لوسی برف کو ٹھوکریں مارتی آگے بڑھ رہی تھی۔ لیکن پھر ایک زبردست طوفان نے اسے آگھیرا۔ لوسی نے بڑی بھاگ دوڑ کی مگر اس کی ایک نہ چلی اور وہ راستہ بھٹک گئی اور طوفان کی نذر ہوگئی۔

لوسی کی ماں کسی نہ کسی طرح گھر پہنچ گئی مگر ظاہر ہے اسے تو لوسی کے بارے میں کچھ علم ہی نہیں تھا۔ جب لوسی کے باپ نے اسے لوسی کے بارے میں بتایا کہ وہ لالٹین لے کر گئی ہے تو اس کی بیوی سخت پریشان ہوگئی۔ اسے تو راستے میں کہیں بھی لوسی نہیں ملی تھی۔

دونوں میاں بیوی لوسی کو ڈھونڈنے نکلے۔ ساری رات وہ دور دور تک اسے آوازیں دیتے رہے مگر لوسی کا کوئی سراغ نہیں ملا۔

اسی کوشش میں صبح ہوگئی۔ اب انہوں نے اس امکان کا جائزہ لینا شروع کیا کہ کہیں لوسی دریا میں تو نہیں گر گئی۔

تھوڑی سی جدوجہد کے بعد لوسی کے قدموں کے نشانات برف پر مل گئے۔ لوسی کے والدین نے قدموں کا تعاقب کیا اور پھر ان کا شک یقین میں بدل گیا کہ لوسی دریا میں گر گئی ہے کیونکہ دریا کے پل کے وسط تک تو لوسی کے قدموں کے نشانات تھے لیکن اس کے بعد کوئی نشان موجود نہیں تھا۔

دونوں روتے دھوتے گھر واپس آگئے۔ بے چاروں کے پاس اور کوئی راستہ بھی تو نہیں تھا۔

لوسی سے سب ہی کو بڑی محبت تھی اور وہ آج تک لوگوں کے دلوں میں موجود ہے۔ چونکہ اس کی لاش نہیں ملی اس لیے بعض لوگوں کا ابھی تک یہ خیال ہے کہ لوسی مری نہیں ہے بلکہ وہ اب تک زندہ ہے۔ کچھ کے خیال میں لوسی کی روح لوگوں کو نظر آتی ہے۔ بہرحال میں نے خود لوسی کو ہنستے کھیلتے دیکھا ہے اور اس کے گانے کی آواز بھی سنی ہے۔ یہ آواز اکثر وادی میں گونجتی محسوس ہوتی ہے۔"

ہم سب بوڑھے چرواہے کی کہانی کے سحر میں کھو چکے تھے۔ شام ہو چکی تھی اور ہلکی ہلکی بوندا باندی کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ بوڑھے کی کہانی ختم ہو چکی تھی لیکن جوزف ایک ٹک دیکھے جا رہا تھا۔ شاید وہ ابھی تک کہانی میں کھویا ہوا تھا اور اسے وادی کے لوگوں کی طرح تصوراتی دنیا میں ہنستی کھیلتی لوسی نظر آ رہی تھی۔ کیا یہ کہانی سچی ہے؟ اس میں حقیقت کا عنصر کتنے فیصد موجود ہے؟ ہم سب دوست جب بھی مل بیٹھ کر پرانی یادیں تازہ کرتے ہیں تو چرواہے کی کہانی اور اس کے کردار ضرور موضوعِ بحث آتے ہیں اور کئی سوال ذہن میں اسی کہانی کے سلسلے میں کلبلاتے ہیں۔

(مرکزی خیال انگریزی نظم "لوسی گرے" سے ماخوذ)

حکایاتِ رُومی

عالم اور ملّاح

علم نحو میں کامل ایک عالم کہیں سفر پر جا رہا تھا۔ راستے میں دریا آیا۔ وہ ایک کشتی پر سوار ہوا۔ ازراہِ خود پرستی اور شیخی ملّاح سے کہنے لگا، "میاں تم نے کچھ صرف و نحو بھی پڑھی ہے؟" ملّاح نے جواب دیا، "نہیں پڑھی۔" عالم نے کہا، "افسوس! تو نے اپنی آدھی عمر ضائع کی۔"

یہ سن کر ملّاح مارے غصے کے بل کھانے لگا۔ لیکن کیا کہتا، خاموش رہا۔ یکایک کشتی ایک زبردست بھنور میں پھنس کر چکر کھانے لگی۔ عالم کے حواس غائب ہوئے، ملّاح نے پکار کر کہا، "مولانا، آپ نے تیراکی بھی سیکھی ہے؟" عالم نے جواب دیا، "بالکل نہیں۔"

ملّاح نے کہا، "حضرت تب تو آپ کی ساری عمر برباد ہوگئی۔ بس چند لمحوں میں کشتی غرق ہونے والی ہے۔"

دوستو! یاد رکھو کہ آدمی کسی ایک فن میں کمال حاصل کرلے تو اس پر شیخی نہیں کرنا چاہیے۔

بے خوف مجاہد

سید سلمان مجید

زرک خان نے پہاڑ کی اوٹ سے نیچے وادی میں جھانکا۔ سرسبز وادی کے بیچوں بیچ سانپ کی طرح بل کھاتی ندی شور مچاتی، پانی کے چھینٹے اڑاتی رواں دواں تھی۔ ندی کا چوڑا پاٹ اس کے حوصلے کو للکار رہا تھا۔

زرک خان کی عقابی نگاہیں شمالی سمت کا جائزہ لینے لگیں جہاں دور کافی فاصلے پر بھارتی فوجیوں نے وادی کے ایک گاؤں کو تباہ و برباد کرنے کے بعد اپنا ہیڈ کوارٹر بنایا تھا اور یہیں ان کے اسلحہ کا سب سے بڑا ذخیرہ موجود تھا جسے تباہ کرنے کی ذمہ داری زرک خان کو سونپی گئی تھی۔

بھارتی فوج جب سے کشمیر کی وادی میں آئی تھی ظلم و ستم، جبر و بربریت کا بازار گرم ہو گیا تھا۔ ظالم بھارتی فوجوں نے نوجوانوں پر ظلم و ستم کے پہاڑ ڈھانے کے ساتھ ساتھ عورتوں، بوڑھوں اور معصوم بچوں کو بھی نہیں بخشا تھا۔ بھارتی فوج کے آنے سے پوری وادی آہوں، سسکیوں اور خون میں ڈوب گئی تھی۔

زرک خان کو ندی کا چوڑا پاٹ عبور کر کے بھارتی فوجوں کے اسلحے کے ذخیرہ تک پہنچنا تھا۔ اس نے اپنی عقابی نگاہیں ندی کے تند و تیز چھینٹے اڑاتے طاقت کے نشے میں سرشار بہتے ہوئے پانی پر ڈالی جو اس کے حوصلے کو للکار رہا تھا۔

اپنی پیٹھ پر بندھے ہوئے بیگ سے رسی کا ایک مضبوط سا گچھا نکال کر اس کا آنکڑہ بنایا۔ پھر اللہ کا نام لے کر پوری قوت سے وہ آنکڑا اس نے دوسری چٹان کی طرف اچھال دیا۔ پہلی کوشش ہی کارگر ثابت ہوئی اور آنکڑا دوسری طرف جا کر نوکیلی

چٹان کے کسی حصے میں پیوست ہو گیا۔ زرک خان نے زور لگا کر اطمینان کر لیا کہ آنکڑا مضبوطی کے ساتھ کہیں پھنس گیا ہے۔ اس نے ایک بار پھر اپنے پاس بیگ میں موجود سامان کا جائزہ لیا اور ہر چیز کا مکمل اطمینان کرنے کے بعد اس نے اللہ کا نام لیکر رسے کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔ اب وہ کسی شاہین کی طرح پرواز کے لئے بالکل تیار تھا۔ کچھ ہی دیر بعد اس نے چھلانگ لگائی اور تقریباً اڑتا ہوا ندی کے گہرے پاٹ کو عبور کر کے دوسری چٹان پر پہنچ گیا۔

ندی کا تند و تیز شور مچاتا، چھینٹے اڑاتا پانی بڑی حیرت سے زرک خان کو پرندے کی طرح دوسری چٹان پر جاتا دیکھتا رہا۔

عصر کا وقت ہو چلا تھا۔ سورج کا رنگ زرد ہونے لگا تھا۔ اس کی تپش میں بھی کمی آگئی تھی۔ "اللہ اکبر"! زرک خان نے عصر کی نماز کی نیت باندھ لی۔ نماز کے بعد اس نے گڑگڑاتے اور روتے ہوئے اپنے مشن کی کامیابی کی دعا مانگی اور پھر کسی چیتے کی طرح چٹانوں کی اوٹ لیتا ہوا بھارتی فوج کے ہیڈ کوارٹر کی طرف بڑھنے لگا۔ جس عمارت میں اسلحہ ذخیرہ کیا گیا تھا، اس کے چاروں طرف بھارتی فوج کا زبردست پہرہ تھا۔

زرک خان اب اسلحہ کے ذخیرہ والی عمارت کے قریب تھا لیکن وہ عمارت کے اندر نہیں پہنچ سکتا تھا کیوں کہ بھارتی فوج پوری طرح چوکس کھڑی تھی۔ شام کے سائے گہرے ہو چلے تھے۔ رات کا اندھیرا آہستہ آہستہ وادی کو اپنی لپیٹ میں لے رہا تھا۔ زرک خان عمارت کے اندر داخل ہونے کی کوئی ترکیب سوچنے لگا۔ پھر اچانک ہی اس نے ایک فیصلہ کر لیا۔ بجلی کی تیزی سے اس کا ہاتھ فضا میں بلند ہوا اور دستی بم عمارت کے عقبی حصہ میں پھٹا۔

عقبی حصہ میں چیخ و پکار مچ گئی لیکن دستی بم نے زیادہ نقصان نہیں پہنچایا تھا صرف کچھ فوجی زخمی ہو گئے تھے۔ زرک خان نے پن کھینچی اور دوسرا دستی بم بھی عقبی حصے کی طرف اچھال دیا۔ دوسرا دھماکہ ہوا۔ افراتفری مچی اور دھواں چاروں طرف پھیل گیا۔ بھارتی فوجی خوفزدگی کی حالت میں ادھر ادھر بھاگنے لگے۔ مین گیٹ خالی ہو گیا تھا۔ بھارتی فوج کی افراتفری کا فائدہ اٹھاتے ہوئے زرک خان مین گیٹ سے ہوتا ہوا عمارت کے اندر داخل ہو گیا بڑی جلدی جلدی اس نے اسلحہ اور گولہ بارود کے ڈھیر کے قریب ڈائنامیٹ لگایا اور ابھی اس نے عمارت سے باہر جانے کے لئے قدم بڑھائے ہی تھے کہ ایک بھارتی افسر چند سپاہیوں کے

ساتھ اندر داخل ہوا۔ "گرفتار کر لو اسے" زرک خان مسکرانے لگا۔ اس کے چہرے پر ایک بے خوف مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ ایک منٹ بعد ڈائنامیٹ پھٹنے والا تھا اور اسلحہ کا پورا ذخیرہ تباہ ہونے والا تھا۔ "اب میری گرفتاری بے کار ہے! اب تو تم لوگ مصیبت میں گرفتار ہونے والے ہو۔ چند سیکنڈ بعد..... چند سیکنڈ بعد..... یہ عمارت آگ کا ڈھیر بن جائے گی اور ہم سب..... زرک خان نے زور سے کلمہ پڑھا۔ بھارتی فوجی ابھی کچھ سمجھ بھی نہ پائے تھے کہ اچانک ڈائنامیٹ پھٹ پڑا اور پوری عمارت ایک زور دار دھماکے کے ساتھ آگ کے شعلوں میں گھر گئی۔ ہیڈ کوارٹر میں موجودہ تمام اسلحہ، گولہ بارود اور تمام بھارتی فوج آگ کا ایندھن بن چکے تھے۔

دور بہت دور سے چند کشمیری مجاہدین نے دوربین لگا کر بموں کے دھماکوں اور شعلے میں گھری عمارت کو دیکھا۔ ان کے لیڈر نے نعرۂ تکبیر بلند کرتے ہوئے کہا "ہمارا مشن کامیاب ہو گیا۔ بے خوف مجاہد نے اسلحہ کا ذخیرہ اڑا دیا ہے۔ ہمیں اس کی واپسی کا انتظار کرنا ہو گا۔" لیکن زرک خان کی واپسی ممکن نہ تھی۔ اس نے شہادت کی موت حاصل کر کے نہ صرف اپنا فرض ادا کر دیا تھا "بلکہ بے خوف مجاہد" کا خطاب بھی حاصل کر لیا تھا۔

آنکھ مچولی

عبدالرشید فاروقی

میرا ایک رسالہ ہے
چاند کا جیسے ہالہ ہے
اچھی اچھی تحریریں ہیں
رنگ برنگی تصویریں ہیں
نظمیں کتنی اچھی ہیں
باتیں کتنی پیاری ہیں
اس کو شوق سے پڑھتے ہیں
جتنے اچھے بچے ہیں
میرا ایک رسالہ ہے
چاند کا جیسے ہالہ ہے

خلفائے راشدین

(خلیفہ اول)

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ

شہلا صدیقی ..... ٹنڈو آدم

زمانہ جاہلیت میں آپ کا نام عبدالکعبہ تھا۔ اسلام قبول کرنے کے بعد اسم گرامی عبداللہ بن قحافہ، کنیت ابو بکر اور لقب صدیق ٹھہرا۔ ظہورِ اسلام سے پہلے بھی حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے گہرے روابط تھے۔ اسلام قبول کرنے کے بعد اپنی تمام دولت جو چالیس ہزار دینار پر مشتمل تھی، رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے قدموں میں ڈھیر کر دی تاکہ اسلام کی ترویج میں کام آسکے۔ بوقتِ ہجرت آپ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد آپ مسلمانوں کے پہلے خلیفہ مقرر ہوئے۔ اس وقت آپ کی عمرِ مبارک ۶۱ سال تھی۔ خلیفہ مقرر ہونے کے بعد آپ نے اپنے خطبے میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا کہ "جب تک میں اللہ اور اس کے رسول کے احکام کے مطابق تمہیں حکم دوں تو تم میرا کہنا مانو ورنہ نہیں۔" آپ نے کاتبِ وحی کو قرآن پاک کے منتشر اجزا کو ایک کتابی صورت میں جمع کرنے کا حکم دیا۔

حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ دو سال ساڑھے تین مہینے خلیفہ رہ کر ۱۳ھ بمطابق ۶۳۴ء میں اس جہان فانی سے رخصت ہوئے۔

ابوّ چپل

(ایک ایکٹ کا ڈرامہ)

لبنیٰ سعدیہ - عزیز آباد، کراچی

کردار ...... دانیہ - بارہ سال کی بچی
ابو - اُدھیڑ عمر کے آدمی (چہرے سے سنجیدگی اور وقار ٹپکتا ہے)
(آغاز)

پردہ اٹھتا ہے۔

سجا ہوا، صاف ستھرا روشن سا کمرہ نظر آتا ہے جس میں دو دروازے ہیں۔ ایک میز اور چند کرسیاں بھی ہیں۔ میز پر گلدان رکھا ہے جس میں موسم کے لحاظ سے پھول سجے ہیں۔ ایک بارہ سال کی بچی میز کرسی پر بیٹھی اپنا ہوم ورک کر رہی ہے۔ اس کا نام دانیہ ہے۔ دروازے پر لگی گھنٹی بجتی ہے دانیہ اٹھ کر دروازہ کھولتی ہے (دروازے پر ابوّ کھڑے ہیں)

دانیہ ...... "السلام علیکم ابوّ"

ابوّ ...... "وعلیکم السلام بیٹے۔ جیتی رہو!"

ابوّ سلام کا جواب دیتے ہوئے اپنے کمرے میں چلے جاتے ہیں۔ کچھ دیر بعد ابو دانیہ کے کمرے میں آکر کہتے ہیں۔

ابوّ ...... "دانیہ بیٹے! ذرا میری چپل تو ڈھونڈ دو مل نہیں رہی ہے۔"

ابو کرسی گھسیٹ کر بیٹھ جاتے ہیں اور اپنے ہاتھ آرام کے انداز میں پھیلا دیتے ہیں

جیسے بہت تھک گئے ہوں۔ دانیہ چپل ڈھونڈنے جاتی ہے اور کچھ دیر بعد واپس آتی ہے۔ اس نے ایک ہاتھ میں ابو کی چپل پکڑی ہوئی ہے۔ وہ جھک کر ابو کے پیروں کے قریب چپل رکھتی ہے اور کہتی ہے۔

دانیہ ..... "ابو چپل ....."

ابو ..... "بیٹے! ذرا میرے پاس بیٹھو اور میرے ایک سوال کا جواب دو۔ (دانیہ دوسری کرسی پر بیٹھ جاتی ہے)

دانیہ ..... "جی پوچھئے ابو!"

ابو ..... کیا تمہیں معلوم ہے کہ ابو جہل کو ابو جہل کیوں کہا جاتا ہے؟"

دانیہ ..... "اس لئے کہ وہ جاہلوں کا باپ تھا۔"

ابو ..... "بالکل ٹھیک۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ تمہیں ابو جہل کے معنی معلوم ہیں لیکن افسوس اس کے باوجود تم نے مجھے "ابو چپل" کہا یعنی کہ میں چپلوں کا باپ ہو"

دانیہ ..... "نہیں ابو" (پریشان ہو جاتی ہے) ابو دانیہ کی پریشانی بھانپ لیتے ہیں مسکراتے ہوئے کہتے ہیں۔

ابو ..... "تمہارا بھی اتنا خاص قصور نہیں ہے۔ اکثر پڑھے لکھے حضرات بھی اس طرح کی غلطیاں کرتے رہتے ہیں اور اسے صحیح سمجھتے ہیں۔ مثال کے طور پر "صلواۃ" معنی نماز کے ہیں۔ عربی میں اس کی جمع "صلواتیں" ہوتا ہے مگر لاعلمی کی وجہ سے ہم اردو دان لفظ صلواتیں "بُرا بھلا" کہنے کے معنوں میں استعمال کرتے ہیں جو کہ غلط ہے بلکہ ایک طرح سے گناہ ہے۔ اسی طرح اعراب کی غلطی (دانستہ یا نادانستہ) کی وجہ سے بھی معنیٰ بدل جاتے ہیں مثال کے طور پر جب ہم "السلام علیکم" کہتے ہیں تو اپنے مخاطب کو سلامتی کی دعا دیتے ہیں کہ آپ پر سلامتی ہو مگر جب ہم "السام علیکم" کہتے ہیں تو اسے درحقیقت مرنے کی بد دعا دیتے ہیں۔

اسی طرح سے سلیمان اور سلمان دو مختلف نام ہیں۔ حضرت سلیمانؑ ایک پیغمبر کا نام ہے جبکہ حضرات سلمانؓ ایک صحابی کا نام ہے اس طرح کی بے شمار مثالیں ہو سکتی ہیں ہمارا فرض ہے کہ ہم اپنی گفتگو میں شائستہ اور اچھے معنوں کے الفاظ استعمال کریں اور دلائل اور وضاحت کے ساتھ بات کریں تاکہ ہمارے مخاطب پر اچھا اثر پڑے اور وہ کوفت کا شکار نہ ہو۔"

"اب یہ بتاؤ کہ تم نے میرے باتوں سے کیا نتیجہ اخذ کیا" ابو آخر میں پوچھتے ہیں۔

دانیہ ...... "یہی کہ آئندہ جب میں آپ کے پاس چپل لے کر آؤں گی تو اسے سامنے رکھ کر کہوں گی "لیجئے...... ابو...... آپ...... کی...... چپل...... میں...... ڈھونڈ...... کر...... لے...... آئی...... ہوں...... (اٹک اٹک کر کہتی ہے) ابو مسکراتے ہیں اور چپلیں پاؤں میں پہن کر دانیہ کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہیں اور کہتے ہیں۔

ابو ...... "بھئی! اتنی دیر لگاؤ گی تو میں چپل پہن کر شام کی چائے پینے جا چکا ہوں گا۔"

دانیہ ابو کی یہ بات سن کر زور سے ہنستی ہے اور ابو مسکراتے ہوئے بڑے دروازے سے باہر چلے جاتے ہیں۔ (پردہ گرتا ہے)

چڑیا

محمد شکیل، راجدھانی

ایک ہے چڑیا بھولی بھالی
پیاری پیاری صورت والی
دانہ دُنکا چگتی ہے وہ
گیت خوشی کے گاتی ہے وہ
صبح سویرے منہ اندھیرے
جاگے اس کے بچے سارے
صبح سویرے جاگو بچو
کہنا بڑوں کا مانو بچو
اچھے اچھے کام کرو تم
روشن اپنا نام کرو تم

ایک عظیم نام قائداعظمؒ

نفیس احمد خان، کوٹڑی سندھ

یوں تو پاکستان بنانے میں کئی اہم شخصیتوں اور لیڈروں نے حصہ لیا، لیکن ایک نام ایسا بھی ہے کہ جو کئی برس گزرنے کے بعد آج بھی دلوں پر نقش ہے اور وہ نام ہے، "حضرت بابائے قوم قائداعظم محمد علی جناحؒ کا۔"

۱۹۴۷ء کی دہائی سے کچھ عرصہ پہلے قائداعظم محمد علی جناح نے برصغیر کے "دس کروڑ" مسلمانانِ ہند کے دلوں میں نہ صرف ایک علیحدہ اور آزاد وطن کا تصور واضح کیا، بلکہ ہر مشکل ترین مرحلے پر ان کا ساتھ دیا۔ پاکستان حاصل کیا اور "بغیر کسی مادی قوت کی مدد کے، آزادی حاصل کر کے ایک نئی تاریخ رقم کی۔

قائداعظمؒ اور دوسرے لیڈروں نے مل کر برصغیر پاک و ہند کے مسلمانوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنے کی کوشش مزید تیز کر دیں۔ ایسے میں علامہ اقبال نے اپنی نظموں اور اشعار کے ذریعے عوام میں ایک نئی روح پھونک دی۔

لاہور کے منٹو پارک (جس کو آج کل اقبال پارک کہتے ہیں) میں ایک تاریخی اجلاس ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو منعقد ہوا جس میں آزاد وطن کی قرارداد مولوی فضل حق نے پیش کی۔ قرارداد منظور کر کے آزادیٔ وطن کی منظور دے دی گئی۔

لاتعداد قربانیوں اور جان کے نذرانوں کے بعد ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء (یعنی قرارداد منظور ہونے کے ٹھیک سات سال بعد) کو پاکستان معرضِ وجود میں آگیا۔ اس تمام عرصے میں قائداعظم محمد علی جناح نے ایک مثالی لیڈر ہونے کا ثبوت دیا۔ بیماری کی حالت میں شدید کمزوری و لاغر بدن کے ساتھ دور دراز کے علاقوں میں جا کر تقریریں کیں، خطابات کیے، وہ خطاب آج بھی زندہ ہیں اور انسانیت کی کامیابی کے علمبردار ہیں۔

ہم تو باز آئے

مہا سواتی، اسلام آباد

ساتھیو۔ واقعی ہم تو باز آئے کرکٹ کھیلنے سے۔ دراصل ہمارے ساتھ بڑا ظلم ہوا ہے۔ ہمیں گلی میں کرکٹ کھیلنے کا شوق تھا۔ ایک دفعہ ہم محلے کے دوسرے ساتھیوں کو لے کر آنٹی عذرا کے گھر کے سامنے اکٹھے ہوئے، وکٹیں لگائیں اور میں نے بیٹنگ شروع کی۔ دو تین گیندیں کھیلنے کے بعد مجھے جوش آیا اور خیالوں ہی خیالوں میں جاوید میانداد سے بھی بڑا کھلاڑی بن بیٹھا اور پھر میرے دوست وقاص نے اب جو مجھے گیند کرائی تو میں نے زور دار شاٹ لگا دیا۔ میں خوش تھا کہ چوکا مارا ہے۔ ہوش تو مجھے تب آیا جب آنٹی عذرا اپنے گھر سے نکل کر آئیں اور تمام لڑکوں کی پٹائی شروع کر دی میرے ساتھیوں نے تو پہلے ہی شور مچا دیا تھا کہ بھاگو آنٹی عذرا کے ڈرائنگ روم کی کھڑکی کا شیشہ ٹوٹ گیا ہے لیکن میں تو خیالوں ہی خیالوں میں ایک بڑا کرکٹر بن چکا تھا، ایک بڑے سے اسٹیڈیم میں کھیل رہا تھا اور تماشائی چاروں طرف بیٹھے تالیاں بجا رہے تھے۔ مجھے اس وقت پتہ چلا جب ایک زور دار تھپڑ میرے گال پر لگا۔ ہمارے کئی ساتھی بھاگ گئے تھے۔ آنٹی عذرا کے ہاتھ میں ہی آیا کیونکہ ٹیم کا کیپٹن جو تھا۔ انہوں نے مجھے کان سے پکڑا اور ابو کے پاس پہنچ گئیں۔ آنٹی عذرا کی شکایت سننے کے بعد ابو نے ہمیں مرغا بنایا اور آنٹی کے گھر کے باہر گلی میں کھڑا کر دیا۔ میں بالکل تنہا نہیں تھا۔ وقاص اور انجم بھی میرے ساتھ مرغا بنے ہوئے تھے کیونکہ آنٹی عذرا نے ان کے گھروں میں

بھی شکایت کی تھی۔ اصل بات تو یہ ہے کہ ہم جب بھی کرکٹ گلی میں کھیلتے کسی نہ کسی گھر کا کم بخت شیشہ ٹوٹتا تھا اور میرے ابو اور میرے دوستوں کے گھر والوں نے کہا تھا کہ اب کبھی شیشہ توڑا تو گلی میں مرغا بنائیں گے۔ چنانچہ ہم مرغا بنے ہوئے تھے اور آنے جانے والے تمام بچے ہمارا مذاق اڑا رہے تھے اور ہمیں دیکھ دیکھ کر تالیاں بجا رہے تھے۔ کرکٹ کا سارا شوق پورا ہو چکا تھا۔ شام تک بچوں کی نظروں کا تماشہ بنے رہے اور توبہ کی کہ آئندہ گلی میں نہیں کھیلیں گے۔

وطن کے شہید

مرسلہ: جہانزیب احمد صدیقی۔ حیدرآباد

سوار محمد حسین شہید بکتر بند رجمنٹ کے پہلے جوان تھے جنہوں نے نشانِ حیدر حاصل کیا۔ ۱۰ دسمبر ۱۹۷۱ء کو جان ہارنے سے قبل ہی وہ فوج کے ایسے روایتی نڈر اور بہادر انسان بننے کا شرف حاصل کر چکے تھے جس کی مثال نہیں ملتی اگرچہ وہ ایک ہلکی گاڑی کے ڈرائیور تھے۔ پھر بھی سنگین خطرے کی حالت میں لڑائی میں شریک ہوئے اور اپنے ساتھیوں کی بڑھ چڑھ کر مدد کی۔ شکر گڑھ کے علاقے میں جب وہ بہبیڑہ گاؤں میں تھے تو ۵ دسمبر کی شب کو ایک خندق میں پہنچ کر توپوں کے لئے گولہ بارود پہنچاتے رہے۔ یہ کام انھوں نے ایسے وقت انجام دیا جب دشمن کی فوج براہِ راست گولہ باری کر رہی تھی۔ وہ ہمیشہ رضا کارانہ طور سے گشت پر باہر جانے کے لئے اپنی خدمات پیش کر دیا کرتے تھے۔ ۹ دسمبر کو ایسے ہی ایک مشن کے دوران ہڑر خورو نامی گاؤں میں انھوں نے کھیڑا نامی گاؤں کے سامنے دشمن کو دیکھ لیا اور نعرۂ تکبیر بلند کرتے ہوئے اپنی رائفل سے دشمن پر گولیاں برسانے لگے۔ ۱۰ دسمبر ۱۹۷۱ء کو وہ دوڑتے ہوئے رجمنٹ کے نائب قائد کے پاس پہنچے اور انھیں دشمن کی ہڑر گاؤں کے سامنے موجودگی سے مطلع کیا۔ دشمن کی فوج ہمارے سرنگ بچھے میدان کے ساتھ پھیلی ہوئی تھی۔ نائب قائد کی ہدایت پر اور خود بھی پہل کرتے ہوئے کبھی ایک ہتھیار سے اور کبھی دوسرے ہتھیار سے کام لیتے رہے اور دشمن پر موثر گولہ باری کرواتے رہے۔

دن ختم ہونے کے بعد انھوں نے رپورٹ پیش کی کہ دشمن کے ۱۶ ٹینک بالکل تباہ

ہوگئے ہیں۔ ان میں سے آٹھ ٹینک ایسے تھے جنہیں ہماری ریکوائل لیس رائفلوں نے تباہ کیا تھا اور ان میں سے ہر ایک کو سوار محمد حسین نے خود ذاتی طور پر پتہ چلا کر تباہ ہونے کی تصدیق کی۔ یہ کام انھوں نے ایسی خطرناک حالت میں انجام دیا جب دشمن کے ٹینک اور فوج مسلسل زبردست گولہ باری کر رہی تھی۔ جب ہماری فوجیں گج گل پہاڑی مورچے پر ڈٹی ہوئی تھیں اور دشمن مسلسل زبردست گولہ باری کر رہا تھا تو وہ بار بار کھڑے ہوتے اور نعرۂ تکبیر بلند کر کے فوج کے حوصلے بڑھاتے رہتے تھے۔ ان کی مثال سے روشنی اور توانائی حاصل کرتے ہوئے ہمارے جوانوں نے نہایت جانبازی کے ساتھ مزاحمت کی اور دشمن کے وہ تمام منصوبے خاک میں ملا دیئے جو ہماری فوجوں کے خلاف بنائے جا رہے تھے۔ جنگ کے دوران وہ ایک گولے کی زد میں آگئے۔ گولہ ان کی چھاتی کو چھلنی کر گیا۔ تھوڑی دیر بعد دشمن کا حملہ ناکام ہو گیا۔ اور سوار محمد حسین شہید کا مقصدِ شہادت پورا ہو گیا۔

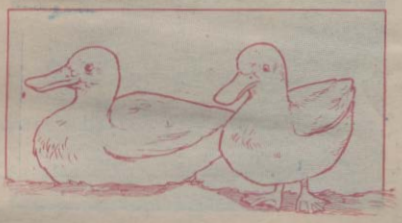

ننھے بچوں کے لئے ایک کہانی

بطخ

جوانا کولاچینسکا، پولینڈ

ایک چھوٹے سے گھر میں ایک بڑھیا اور ایک بوڑھا رہتے تھے۔ ایک دن وہ دونوں کھمبیاں تلاش کرنے جنگل کی طرف گئے۔ وہاں ان کو ایک چھوٹی سی بطخ نظر آئی جو ایک پاؤں سے لنگڑا رہی تھے۔ ان کو اس بطخ پر رحم آیا۔ وہ اس کو اپنے ساتھ گھر لے آئے۔

دوسرے دن وہ دونوں کھمبیاں تلاش کرنے کے لئے پھر جنگل گئے اور بطخ کو اپنے گھر کے ایک گھونسلے میں رکھا۔ یہ گھونسلہ پروں سے بنا ہوا تھا۔ جب وہ جنگل کی طرف چلے گئے تو بطخ لڑکی کی شکل میں تبدیل ہو گئی اور اس نے گھر کی صفائی شروع کی۔ پھر پانی بھرا، کھانا پکایا۔ جب بڑھیا اور بوڑھا گھر واپس آئے تو بڑے حیران ہوئے کہ اتنا سارا کام کس نے کیا؟ انہوں نے پڑوسیوں سے پوچھا تو پڑوسیوں نے بتایا کہ ایک لنگڑی لڑکی آپ کے گھر پانی بھر کے لا رہی تھی۔ اگلے دن وہ بوڑھا اور بڑھیا بطخ سے جنگل جانے کا کہہ کر نکلے لیکن اصل میں وہ دونوں چھپ کر اس بطخ کی حرکات و سکنات دیکھنا چاہتے تھے۔

چنانچہ وہ ایک جھونپڑی میں چھپ گئے جہاں پر لکڑیاں پڑی ہوئی تھیں۔ وہ دیکھنا چاہتے تھے کہ گھر میں کون آتا ہے اور سارا کام کون کرتا ہے؟ ادھر جب وہ دونوں چلے گئے تو بطخ پھر لڑکی بن گئی اور جب وہ پانی لینے چلی گئی تو بڑھیا اور بوڑھے نے اس کے اتارے ہوئے پر آگ میں پھینک دیئے جس سے بطخ کے سارے پر جل گئے۔

جب لڑکی واپس آئی اور اس نے دیکھا کہ اس کے پر جل گئے ہیں تو وہ رونے لگی۔ "پروں کے بغیر میں کیسے رہونگی؟ مجھے بطخ کا لباس چاہئے۔" آخر کار اس نے بڑھیا اور بوڑھے سے ایک چرخہ مانگا۔

وہ چرخہ لے کر گھر کے سامنے بیٹھ گئی اور سوت کاتنے لگی۔ اچانک اس نے دیکھا کہ سامنے سے کچھ جنگلی ہنس آرہے ہیں۔ لڑکی نے ایک ہنس سے کہا کہ "پیارے ہنس مجھے اپنا ایک پر دے دیجئے۔" ہنس نے لڑکی کو جواب دیا کہ "نہیں پیچھے دوسرے ہنس آرہے ہیں ان سے مانگنا وہ دے دیں گے۔" لڑکی نے پیچھے آنے والے دوسرے ہنس سے پر مانگے کہ وہ سب اس کو اپنا ایک ایک پر دے دیں لیکن انھوں نے بھی یہ ہی جواب دیا کہ پیچھے اور ہنس آرہے ہیں اُن سے مانگو۔

پھر اچانک ایک بہت بڑا بطخ وہاں آیا۔ اور اس نے خود سے لڑکی کی طرف اپنا ایک پر پھینک دیا۔ لڑکی پر لے کر دوبارہ بطخ بن گئی اور فوراً وہاں سے اڑ گئی۔ بعد میں بڑھیا اور بوڑھے بہت روتے اور اس کو یاد کرتے تھے لیکن وہ لڑکی دوبارہ کبھی واپس نہیں آئی۔

- ..... قائداعظم صبح اٹھتے ہی خبریں سنتے تھے یا اخبار پڑھا کرتے تھے۔
- ..... جناح گجراتی زبان کا لفظ ہے، جس کے معنی عربی میں "بازو" کے ہیں۔
- ..... قائداعظم کا آبائی وطن کاٹھیاوار ہے۔ مادری زبان گجراتی ہے۔
- ..... قائداعظم محمد علی جناحؒ ۲۵ دسمبر ۱۸۷۶ء کو کراچی کی ایک عمارت "وزیر مینشن" میں پیدا ہوئے۔
- ..... قائداعظم کے ذاتی پرچم کا رنگ گہرا نیلا تھا۔
- ..... قائداعظم کی دوسری بیوی رتی بائی تھیں۔
- ..... قائداعظم کا پسندیدہ لباس شیروانی، کرتہ پاجامہ اور جناح کیپ تھا۔

بچپن کے ساتھی

محمد سعید احمد خان ۱۸ سال فرسٹ ایئر
اردو اچھا انسان بننا پرائیویٹ تعلیم
۱۰/۳۱، ایریا ۳۶/بی لانڈھی کراچی

محمد سجاد ۱۶ سال دہم
ریاضی پولیس آفیسر گورنمنٹ جامعہ اسکول
مکان ۲۷، گلی ۹ زیڈ بلاک، نیو ملتان

ضیغم عباس ۱۲ سال ہشتم
انگلش انجینئر پبلک اسکول
۱۴/ای امانی شاہ کالونی لطیف آباد حیدرآباد

شاہ رخ ہمایوں ۱۲ سال ہشتم
ریاضی پائلٹ گورنمنٹ ہائر سیکنڈری
محمد یعقوب، صراف بازار پنڈی بھٹیاں

دانش عبدالبصیر ۱۰ سال ششم
سائنس آرمی آفیسر ماڈلیسٹ اسکول
ایل/۱۱ [illegible] کراچی

عبدالباقی نور ۱۶ سال فرسٹ ایئر
بیالوجی ڈاکٹر ڈگری کالج تربت
ڈان ہوٹل ملک آباد، تربت، مکان نمبر ۲

ایس ارشاد علی ۱۶ سال دہم
بیالوجی ڈاکٹر گورنمنٹ اسکول
مسلم جنرل اسٹور، شفیق کالونی ایف بی ایریا کراچی

محمد اسماعیل سرسانہ ۱۳ سال ششم
انگلش اداکار گورنمنٹ ماڈل اسکول
۱۰۸، ایل، ۱۰۰ فٹ روڈ شاہ رکن عالم کالونی نیو ملتان

ندیم احمد مہر ۱۳ سال ہشتم
انگلش ڈاکٹر گورنمنٹ ماڈل ہائی اسکول
میری گلگت ضلع تربت

محمد نعیم ۱۳ سال ہفتم
ریاضی کرکٹر قائد ایلیمنٹری اسکول
مومن کالونی فیڈرل بی ایریا، کراچی

سردار خان ۱۸ سال بارہویں
انگلش پروفیسر کا گورنمنٹ کالج
ڈاک خانہ دریہ شریف ضلع و تحصیل اٹک

زوہیب شاہ ۱۱سال ششم
سائنس کمپیوٹر انجینئر ایف جی ماڈل
۱۱۶۲ گلی ۴۱ جی ۱۰/۴ اسلام آباد

محمد ابرار شکیل ۱۰سال ششم
سائنس آرمی آفیسر پلے ہاؤس
۱۸۱۔ بہادر آباد، کراچی

عشرت علی ۱۶سال ڈی کام
اردو سی اے گورنمنٹ کامرس کالج
ڈی۔بی/۳۶۰ دیپالپور بازار ساہیوال

ممتاز علی اعوان ۱۳سال
سائنس پائلٹ بی ایم ٹی ایف اسکول
ایچ ۲۵۵، یبرا اسکوائر، لانڈھی

حافظ ظفر اقبال ۱۶سال دہم
انگلش ڈاکٹر تعمیر ملت اسکول
محلہ اعواناں، سوہدرہ، گوجرانوالہ

منصور احمد اعوان ۱۶سال نہم
اسلامیات انجینئر البدر ٹیکنیکل اسکول
سعید آباد، بلدیہ ٹاؤن، کراچی

ملک عبدالجبار ۱۴سال نہم
سائنس پولیس آفیسر بہاء اسکول
امام بخش ہاؤس پھلجی اسٹیشن ضلع دادو

نعیم اللہ زرکون ۱۶سال دہم
کیمسٹری سی ایس ایس کیڈٹ کالج
کیڈٹ کالج مستونگ، بلوچستان

ساجد اللہ ۱۴سال دہم
انگلش ڈاکٹر دارالعلوم ٹی ایم کے
پوسٹ آفس وسی ملوک شاہ، ٹنڈو محمد خان

آنکھ مچولی کا سالانہ خریداری کا کوپن

نام ____________________

مہینہ جس سے رسالہ شروع کروانا چاہتے ہیں ____________________

رقم ____________________ بذریعہ ____________________

پتہ ____________________

____

فون نمبر ____________________

گندے بچوں کی پہچان شکل سے لگتے ہیں شیطان
اچھے بچوں کی پہچان شکل سے لگتے ہیں انسان
گندے بچے شور مچائیں اچھے بچے چپ ہوجائیں
گندے بچے لڑتے ہیں اچھے بچے پڑھتے ہیں

مقابلہ

مدیحہ اشرف ملک، لاہور

آگے صرف وہ بڑھتے ہیں کام جو شوق سے کرتے ہیں
وقت جو اپنا گنواتے ہیں سدا وہی پچھتاتے ہیں
بچو ہم کو پڑھنا ہے سب سے آگے بڑھنا ہے
یہ ہے قائد کا فرمان وطن تمہاری ہے پہچان
علم سے ہوگا اونچا نام کام ہی کام ہو صبح و شام

"جب سے میں
معیار بناسپتی میں کھانے پکا رہی ہوں
میرے بچّے کھانا بڑے شوق
سے کھاتے ہیں!"
ٹی وی آرٹسٹ لیلیٰ زبیری کہتی ہیں
معیار
بناسپتی
صحت، توانائی، لذّت کا معیار
معیار بناسپتی سے برقرار
عام بناسپتی سے قیمت صرف تھوڑی زیادہ
مگر معیار بناسپتی کوالٹی میں بہت بہتر!
حبیب آئل ملز (پرائیویٹ) لمیٹڈ
D-38 ایس۔ آئی۔ ٹی۔ ای۔ کراچی فون، 292006-292926
MASS

منزل بہ منزل، تازگی کا حامل!

احمد

ٹماٹو کیچپ

کیچپ کا اصل مزہ تو اس کی تازگی میں ہے۔ احمد ٹماٹو کیچپ ملک بھر میں سب سے زیادہ فروخت ہوتا ہے لہٰذا تازہ بتازہ آپ تک پہنچتا رہتا ہے۔ یوں بھی فارم سے صارفین تک پہنچنے میں احمد ٹماٹو کیچپ کو صرف عرصۂ تیاری درکار ہوتا ہے۔ تازگی کا یہ دعویٰ کسی اور کیچپ کے لئے ممکن نہیں۔

احمد ٹماٹو کیچپ کا نام — لذت اور تازگی کا پیغام